پاکستان – رپورٹ برائے انسانی حُقوق ۲۰۲۰ء

انتظامی خلاصہ

پاکستان ایک وفاقی پارلیمانی ریاست ہے۔ ۲۰۱۸ء میں پاکستان تحریکِ انصاف (پی ٹی آئی) نے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کی سب سے زیادہ نشستیں حاصل کیں اور پارٹی کے سربراہ عمران خان وزیر اعظم بن گئے۔ اگرچہ آزاد مبصرین نے الیکشن کمیشن آف پاکستان کی طرف سے پولنگ کے عمل میں بعض تکنیکی بہتریوں کو محسوس کیا، کچھ مبصرین، سول سوسائٹی کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے الیکشن سے قبل فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی طرف سے مداخلت کے حوالے سے اپنی تشویش کا اظہار کیا جس کی وجہ سے مقابلے کا غیر منصفانہ ماحول بن گیا۔ بعض سیاسی جماعتوں نے الیکشن کے دن قابل ذکر بے قاعدگیوں کا الزام لگایا۔

ملک کے زیادہ تر حصوں میں داخلی سلامتی کو برقرار رکھنا پولیس کی ذمہ داری ہے۔ مقامی پولیس صوبائی حکومتوں کے ماتحت فرائض سرانجام دیتی ہے۔ نیم فوجی ادارے، بشمول فرنٹیئر کور، جو بلوچستان اور سابقہ قبائلی علاقہ جات سمیت خیبر پختونخوا میں کام کرتی ہے اور رینجرز، جو سندھ اور پنجاب میں فعال ہیں، وزارتِ داخلہ کے اختیارات کے تحت حفاظتی خدمات فراہم کرتی ہیں۔ فرنٹیئر کور کا بنیادی مقصد پاکستان۔افغانستان سرحد کی حفاظت ہے اور فرنٹیئر کور پُر امن حالات میں وزارتِ داخلہ جبکہ جنگی صورتحال میں فوج کو رپورٹ کرتی ہے۔ فوج بیرونی سلامتی کی ذمہ دار ہے تاہم داخلی سلامتی کے معاملات میں کردار ادا کرتی رہتی ہے، بشمول سابقہ فاٹا کے متعدد علاقوں میں صفِ اوّل کی سلامتی ایجنسی کے طور پر خدمات دینے کے۔ اگرچہ سرکاری طور پر تو فوج اور جاسوسی ادارے سویلین حکام کو رپورٹ کرتے ہیں تاہم فوج اور جاسوسی ادارے آزادانہ طور پر اور بغیر موثر سویلین نگرانی کے کام کرتے ہیں۔ سلامتی اداروں کے ارکان متعدد خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوئے۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے تشویشناک واقعات میں درج ذیل واقعات شامل تھے: حکومت یا اس کے کارندوں کے ہاتھوں غیر قانونی یا صوابدیدی قتل کے اقدامات بشمول ماورائے عدالت قتل، حکومت یا اس کے ایجنٹوں کے ہاتھوں جبری گمشدگی، تشدد اور

ظالمانہ، غیر انسانی اور ہتک آمیز سلوک یا سزا، صوابدیدی حراست، جیلوں کے سخت یا جان لیوا حالات، سیاسی قیدی، بیرون ملک مقیم افراد کے خلاف سیاسی بنیادوں پر مبنی تادیبی کارروائیاں، ذاتی معاملات میں حکومت کی غیر قانونی یا جبری مداخلت، آزادی اظہار کے ذرائع، پریس اور انٹرنیٹ پر بدترین نوعیت کی پابندیاں، بشمول صحافیوں پر تشدد، صحافیوں کی غیر منصفانہ حراست اور گمشدگی، سینسر شپ، ویب سائیٹس کی بندش، پُرامن اجتماع اور انجمن سازی کے حقوق میں قابل ذکر سرکاری مداخلت، جیسا کہ غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے خلاف سخت گیر قوانین کا اطلاق، مذہبی آزادی پر سخت پابندیاں، نقل و حرکت کی آزادی پر بڑی پیمانہ کی پابندیاں، افسر شاہی میں بدعنوانی، خواتین کے خلاف تشدد کی کارروائیوں کی تفتیش اور احتساب کی کمی، غیر ریاستی عسکری گروہوں کی جانب سے نابالغ فوجیوں کی غیر قانونی بھرتی اور اُن کا جنگوں میں استعمال، انسانوں کی غیر قانونی منتقلی، نسلی اور لسانی اقلیتوں کے خلاف مجرمانہ کارروائیاں، "ایل جی بی ٹی آئی" افراد کے خلاف غیر ریاستی عناصر کی جانب سے تشدد اور دھونس دھمکیاں، بالغ افراد کے درمیان باہمی مرضی سے جنسی عمل کو قابل سزا جرم قرار دینے والے قوانین کا وجود یا استعمال، مزدوروں کی انجمن سازی کی آزادی پر بندش اور بچوں سے بدترین جبری مشقت یا بیگار شامل ہیں۔

حکومت کے احتساب کی کمی رہی اور بدعنوانی کے واقعات پر پر تادیبی کارروائی نہیں ہو سکی، جس کی وجہ سے ان کاموں میں سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر ملوث افراد میں سزا سے بالاتر ہونے کا کلچر پروان چڑھا۔ ارباب اقتدار نے شاذونادر ہی سرکاری اہلکاروں کے خلاف انسانی حقوق کی پامالیوں پر تادیبی کارروائی کی۔

غیر ریاستی عناصر کی جانب سے دہشتگردانہ تشدد اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں نے انسانی حقوق کے مسائل میں اضافہ کیا تاہم دہشتگرد کارروائیوں میں مجموعی کمی سے ہم آہنگ، اس نوعیت کے واقعات گزشتہ سالوں کی نسبت کافی کم تعداد میں رُونما ہوئے۔ فوج، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی جانب سے دہشتگرد گروپوں اور جنگجوئوں کے خلاف خاطر خواہ کارروائیاں جاری رہیں۔ تاہم مقامی اور بیرونی تشدد پسند تنظیموں اور غیر ریاستی عناصر کی جانب سے تشدد، بدسلوکی، معاشرتی اور مذہبی عدم برداشت نے لاقانونیت کے کلچر کو فروغ دیا۔ جنوبی ایشیا ٹیررزم پورٹل، جو کہ انسٹی ٹیوٹ فار کونفلکٹ مینجمنٹ کا عوامی مفاد کی پیروی کرنے والا ادارہ ہے اور جو جنوبی ایشیا میں دہشتگردی اور کم شدت کی جنگجوانہ کارروائیوں کے حوالے سے اعداد و شمار جمع کرتا ہے، کے پاس موجود اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۹ء میں مجموعی طور پر ۳۶۵ اموات کی نسبت، گزشتہ سال دسمبر تک ۴۹۹ جانیں ضائع ہوئیں۔

حصہ اول: انسانی زندگی کی سلامتی کا احترام، بشمول:

الف) زندگی سے جبری محرومی اور دیگر غیر قانونی ہلاکتیں یا سیاسی قتل

ایسی بیشمار اطلاعات تھیں جن کے مطابق حکومت یا اس کے کارندوں نے اندھا دھند یا غیر قانونی طور پر لوگوں کو ہلاک کیا۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ملک بھر میں مختلف تنازعات میں ماورائے عدالت ہلاکتوں میں ملوث رہے (ملاحظہ کریں حصہ اول کا سیکشن ز)۔ سرکاری ادارے صرف یہ تفتیش کرتے ہیں کہ کیا سلامتی اداروں کی جانب سے ہلاکتوں کا جواز موجود تھا یا قانونی پیروی انسپکٹر جنرل آف پولیس کے حکم کے تحت کی جائے یا قومی کمیشن برائے انسانی حُقوق کے توسط سے۔

بروز تیرہ اگست تربت بلوچستان میں فرنٹیئر کور نے کراچی یونیورسٹی کے طالبعلم حیات بلوچ کو قتل کیا، جس کو متوفی کے خاندان والوں نے ماورائے عدالت قدم قرار دیا، کراچی اور بلوچستان میں احتجاجی مظاہروں کے بعد مقامی پولیس نے ایک ایف سی اہلکار کو گرفتار کیا۔ بروز تیرہ جولائی ایک نوجوان احسان اللہ بخش بلوچستان کے علاقہ خاران کے ایک تھانہ میں مردہ حالت میں پایا گیا، جہاں پر وہ پولیس کی حراست میں زیر تفتیش تھا۔ پولیس نے دعویٰ کیا کہ بخش نے خودکشی کی ہے جبکہ بخش کے خاندانوں والوں نے پولیس کو اُس کے قتل کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ ردعمل میں پندرہ اور سولہ جولائی کے دن پریس کلب اور ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے باہر احتجاج کیا گیا جس میں مظاہرین نے بخش کی موت کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے واقعہ کی غیر جانبدارانہ تفتیش کا وعدہ کیا جبکہ چھ پولیس اہلکاروں کو غفلت برتنے پر معطل بھی کیا گیا۔

یکم مئی کو پشتون تحفظ موومینٹ (پی ٹی ایم) کے کارکن عارف وزیر کو نامعلوم افراد نے جُنوبی وزیرستان میں اپنے گھر کے باہر گولی کا نشانہ بنایا۔ وہ بعد ازاں اسلام آباد کے ایک اسپتال میں دم توڑ گیا۔ معروف قبائلی شخصیت اور پشتون حُقوق کے رہنماء عارف وزیر ہلاکت سے کچھ عرصہ قبل ہی جیل سے رہا ہوا تھا، مارچ میں افغانستان کے دورے کے دوران پاکستانی فوجی اسٹیبلشمنٹ پر تنقید کے بعد ملک واپسی پر ان کو گرفتار کیا گیا تھا۔

افغان حُکام کے مطابق ۳۰جولائی کو چمن، بلوچستان کے قریب پاکستان اور افغان فوجوں کے درمیان فائرنگ کے تبادلہ میں متعدد عام شہری جاں بحق ہوئے۔ ۳۱جولائی کو پاکستان کی وزارت خارجہ کی جانب سے جاری کردہ بیان میں کہا گیا کہ بین الاقوامی سرحد پر پاکستان کی حُدود میں موجود معصوم شہریوں پر افغان فوج کی بلااشتعال فائرنگ کے جواب میں پاکستانی فوج نے اپنے دفاع میں جوابی کارروائی کی۔ فائرنگ کے تبادلہ کا واقعہ ۳۰جولائی کو ہونے والے احتجاجی مظاہرہ پر نیم فوجی دستوں ایف سی کی جانب سے فائرنگ کے بعد پیش آیا، جس میں تازہ کھولی گئی چمن سرحد راہداری کو پار کرنے کی کوشش کرنے والے افراد نشانہ بنے۔

دورانِ حراست جسمانی تشدد کے باعث مبینہ طور پر کچھ ملزمان کی موت کے واقعات رونما ہوئے۔ مقدمات کو طول دینے اور قتل کے ذمہ دار حکام کے خلاف کارروائی اور سزا میں ناکامی نے قانون سے بالا ہونے کے تاثر کو مزید گہرا کیا۔

پولیس پر ہلاکت خیز حملوں کی بیشمار رپورٹیں سامنے آئیں۔ ۱۸فروری کو ملک کے شمال مغربی علاقہ میں انسداد پولیو ٹیم کو تحفظ فراہم کرنے والی گاڑی کی راہ میں دھماکہ کے نتیجہ میں ایک پولیس اہلکار جاں بحق جبکہ دو زخمی ہوئے۔ ۱۸مئی کو مچھ، بلوچستان میں حملہ آوروں کی جانب سے دھماکہ خیز مادہ کے حملہ میں ایف سی کے چھ اہلکار زخمی ہوئے۔

جنگجوئوں اور دہشتگرد گروپوں نے خودکش حملوں، بم دھماکوں اور دیگر پُر تشدد واقعات میں سینکڑوں لوگوں کو ہلاک اور مزید سینکڑوں افراد کو زخمی کیا۔ لیکن گزشتہ برسوں کی نسبت ہلاکتوں میں کمی واقع ہوئی۔ اس ضمن میں مزید مطالعہ کے لیے حصہ اول کا ذیلی حصہ ز ملاحظہ کریں۔
بروز ۲۷اکتوبر کو بلوچستان کے ایک مدرسہ میں بم دھماکہ کے نتیجہ میں چھ طالبعلموں سمیت آٹھ افراد جاں بحق اور ایک سو دیگر زخمی ہوئے۔ کسی بھی گروہ نے حملہ کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

ب) گمشدگی

ملک کے تقریباً تمام ہی علاقوں میں اغواءاور جبری گمشدگی کے واقعات رونما ہوئے۔ مبینہ طور پر خفیہ ایجنسیوں، پولیس اور قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں نے اپنے زیر حراست افراد کو کسی بھی قسم کے رابطوں سے محروم رکھااوران کی جائے حراست کو خفیہ رکھا۔ آزادانہ طور پر فعال غیر سرکاری تنظیم انسانی حُقوق کمیشن پاکستان کے اندازہ کے مطابق ملک میں ۲۱۰۰لوگ لاپتاہیں اگرچہ گم شدہ افراد کی تعداد شاید زیادہ ہی ہو۔

جون میں حُکام نے تصدیق کی کہ خیبر پختونخوا میں انسانی حُقوق کے کارکن ادریس خٹک سولہ نومبر ۲۰۱۹ءسے قانون نافذ کرنے والے اداروں کی حراست میں ہے۔ سابقہ قبائلی علاقہ جات میں انسانی حُقوق کی خلاف ورزیوں پر کام کرنے والے ادریس خٹک اُس وقت گم ہوئے تھے جب خیبر پختونخوا میں اُن کی گاڑی کو سیکیورٹی اہلکاروں نے روکا تھا۔ جون میں حُکام نے اعتراف کیا کہ وہ حراست میں ہے اوراس پر برطانوی سامراج کے ۱۹۲۳ءکے سرکاری صیغہ راز قانون کے تحت فرد جرم لاگو کرنے کی تیاری کی جارہی ہے، جس کے نتیجہ میں طویل قید یا سزائے موت مل سکتی ہے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں کی اطلاعات کے مطابق بہت سے حکام نے پشتون، سندھی اور بلوچ انسانی حقوق کارکنوں اور سندھی اور بلوچ قوم پرستوں کو بغیر عذر اور وارنٹ گم یا گرفتار کیا۔ بعض واقعات میں والدین پر دباؤ بڑھانے کے لیے بچوں کو بھی گرفتار کیا گیا۔ انسانی حُقوق کارکنوں کے مطابق پانچ سو سندھی لاپتاہیں، جن میں سے صرف ۲۰۲۰ءمیں ساٹھ سے زیادہ افراد کو جبری طور پر گم کر دیا گیا۔

بروز دس اگست نامعلوم عناصر نے یونیورسٹی پروفیسر اور سندھ کے انسانی حُقوق کارکن سارنگ جویو کو کراچی میں اپنے گھر سے اغوا کیا۔ جویو کی اہلیہ نے الزام عائد کیا کہ باوردی اور سادہ لباس میں ملبوس افراد سارنگ کے اغوا میں ملوث تھے۔ جویو چھ دن کے بعد بازیاب ہوئے اور جسم پر تشدد کے نشانوں کی وجہ سے اُن کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔

سال کے دوران اسی انداز سے صحافیوں، وکیلوں اور دیگر کارکنوں کو بھی نامعلوم عناصر کی جانب سے اغوا کے کچھ دنوں بعد چھوڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اُن میں مطیع اللہ جان، بلال فاروقی اور علی عمران کے علاوہ سابقہ صحافی ساجد گوندل اور وکیل محب لغاری شامل تھے۔ سول سوسائٹی نے سلامتی اداروں کو حراستوں کا ذمہ دار قرار دیا۔

بروز ۷ اجون متحدہ قومی موومینٹ لندن کے کارکن آصف حسین صدیقی کی لاش ملی، وہ متعدد دنوں سے لاپتا تھا۔

ج) تشدد اور دیگر وحشیانہ اور غیر انسانی یا ہتک آمیز رویے اور سزائیں

اگرچہ آئین تشدد اور دیگر وحشیانہ، غیر انسانی، اور توہین آمیز طرز عمل کی ممانعت کرتا ہے مگر فوجداری قوانین میں تشدد کے خلاف کوئی مخصوص دفعہ نہیں ہے۔ فوجداری قوانین طاقت کے مجرمانہ استعمال اور حملہ سے ممانعت کرتا ہے تاہم ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ سیکورٹی اداروں بشمول خفیہ اداروں نے اپنی تحویل میں موجود افراد کو تشدد اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا۔

انسانی حقوق کے حوالے سے کام کرنے والی تنظیموں نے محسوس کیا کہ حکومت کی طرف سے تشدد کو روکنے کے لئے سنجیدہ کوششوں کی کمی ہے اور دعویٰ کیا کہ تشدد روا رکھنے والے بنیادی طور پر پولیس، فوج اور خفیہ ایجنسیوں کے اہلکار بغیر کسی جوابدہی اور تادیبی کارروائی کے کام کرتے رہے۔

چوبیس جون کو سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والے وڈیو میں پشاور کی ایک پولیس اسٹیشن میں اہلکاروں کی جانب سے ایک شخص کے کپڑے اتارنے اور بدسلوکی کا واقعہ سامنے آیا۔ جنوری میں سندھ پولیس کے انسپیکٹر جنرل کلیم امام نے دعویٰ کیا کہ انسداد دہشتگری محکمہ (سی ٹی ڈی) کے بعض افسران بھتہ خوری اور اغوا میں ملوث ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بعض سینیئر افسران نے ایسے کرتوتوں میں ملوث افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کے بجائے اُن کی حوصلہ افزائی کی ہے۔

ذرائع ابلاغ اور سول سوسائٹی تنظیموں نے پولیس حراست میں مبینہ تشدد کے نتیجہ میں شہریوں کی ہلاکتوں کی اطلاعات دیں۔ ۹ جولائی کو سانگھڑ، سندھ میں ایک قیدی پیرل خاصخیلی کی لاش پولیس حوالات میں برآمد ہوئی۔ اُس کے رشتہ داروں نے پولیس کو موت کا ذمہ دار ٹھہرایا جبکہ پولیس نے دعویٰ کیا کہ قیدی نے خودکشی کی ہے۔

اقوام متحدہ کے امن دستوں میں طرز عمل کے بارے میں آن لائن ذرائع ابلاغ کے مطابق فروری میں دارفر میں افریقن یونین یو این مشترکہ آپریشن میں تعینات ایک پاکستانی اہلکار کے خلاف جنسی استحصال کی ایک شکایت موصول ہوئی کہ اُس نے کسی بالغ کے ساتھ جنسی زیادتی کی ہے۔اکتوبر تک موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق حکومت پاکستان واقعہ کی تفتیش کر رہی تھی۔

ایسی اطلاعات موجود تھیں کہ پولیس اہلکاروں نے ظالمانہ اور توہین آمیز سلوک اختیار کیااور سزائیں دیں۔ایچ آر سی پی کے مطابق پولیس نے ستمبر ۲۴تک موصول ہونے والی اطلاعات کے موجب ۲۹ مقدمات میں حُدود سے تجاوز کیااور ۱۴لوگوں کو قتل اور ۲۳ کو زخمی کیا۔متعدد ذرائع کے مطابق پولیس کی جانب سے سفاکی کے اقدامات کہیں زیادہ ہیں۔

سیاسی اثر رسوخ، بدعنوانی اور بدسلوکیوں کی خلاف ورزیوں کی موثر تفتیش کے ڈھانچہ کی عدم دستیابی کی وجہ سے سیکیورٹی فورسز کو سزاو جزا سے بالا ہونا تادیبی کارروائیوں کی راہ میں ایک نمایاں رکاوٹ تھی۔

جیل اور حوالات کی صورتحال

کچھ سویلین جیلوں اور فوجی حراستی مراکز کی صورتحال انتہائی مخدوش اور گنجائش سے زیادہ قیدیوں، ناکافی خوراک اور دوائوں اور ناگفتہ بہ حفظان صحت کی صورتحال کی بدولت زندگی کے لئے بہت خطرناک تھی۔

جیلوں کی حالتِ زار: عام طور پر جیلوں کی صورتحال انتہائی خراب تھی۔گنجائش سے زیادہ افراد کی موجودگی ایک سنگین مسئلہ تھی اور اس کی وجہ فوجداری نظام کے ڈھانچہ میں پائی جانے والی بنیادی خرابیاں تھیں جس کی وجہ سے مقدمے سے پہلے قید کئے جانے والے حوالاتیوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ جیل حکام کی جانب سے ماہ اگست تک مہیا کردہ اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر کی ۱۱۶ جیلوں میں قیدیوں کی کل تعداد ۸۲ ہزار ۱۳۹ تھی۔ جیلوں میں ۶۴ ہزار ۹۹ قیدیوں کی گنجائش ہے،اس حساب سے گنجائش سے ۲۸ فیصد زیادہ لوگ قید ہیں۔

ناکافی خوراک اور طبّی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے پرانی بیماریاں عام رہیں۔ناکافی غذا ایک مسئلہ بنی رہی خاص طور سے ان قیدیوں میں جو اپنے کنبہ یا دوستوں کی طرف سے اس سلسلے میں کسی مدد سے محروم رہے۔ متعدد جگہوں پر صفائی ستھرائی کا نظام، ہوا کا گزر، روشنی اور پینے کے صاف پانی تک رسائی ناکافی تھے۔ بیشتر جیل پرانی طرز پر بنے ہوئی تھیں اور ان میں اندرونی درجہ حرارت کو کنٹرول کرنے کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ بنیادی اور فوری طبّی سہولیات کا ایک نظام تھا، مگر اس تک رسائی دفتری طریقہ کار کی پیچیدگیوں کی وجہ سے دشوار رہی۔ کسی معذوری کا شکار قیدی اکثر دیکھ بھال سے محروم رہے۔عیسائی اور احمدی برادریوں کے نمائندوں کے مطابق ان کی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے قیدی اکثر جیل میں دوسرے قیدی ساتھیوں کے ہاتھوں بدسلوکی اور تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ سول سوسائٹی تنظیموں کے مطابق ایسے ملزمان جن پر توہین مذہب کے الزامات ہوتے ہیں وہ اکثر و بیشتر جیل حکام کے بُرے سُلوک کا نشانہ بنتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق توہین مذہب کے بیشتر ملزمان کو لمبے عرصہ کے لئے قید تنہائی میں رکھا جاتا ہے جو بعض اوقات ایک سال سے بھی زیادہ دورانیہ پر محیط رہا۔ جبکہ حکومت کا یہ کہنا ہے کہ ایسا اس ملزم کی حفاظت کے پیش نظر کیا جاتا ہے کیونکہ خدشہ ہوتا ہے کہ ایسے ملزم کو دیگر عام ملزمان کی جانب سے خطرات درپیش ہوتے ہیں۔

حکام خواتین قیدیوں کو مرد قیدیوں سے الگ رکھتے ہیں۔تاہم خواجہ سرا افراد کے حقوق کے تحفظ کا قانون مجریہ ۲۰۱۸ پاس ہونے کے باوجود، جو جداگانہ قید کی سہولت کی ضمانت دیتا ہے، این جی اوز نے اطلاعات دی کہ حکام نے خواجہ سرا خواتین کو مردوں کے ساتھ قید رکھا جس کے باعث ان کو حراسگی کا سامنا کرنا پڑا۔ بلوچستان میں عورتوں کے لئے الگ جیل نہیں ہے، تاہم حکام نے عورتوں کو علیحدہ بیرکس میں زیر حراست رکھا۔

بنیادی ڈھانچے کی عدم موجودگی کے باعث جیل حکام نے اکثر و بیشتر گرفتار افراد کو سزا پانے والے مجرموں سے الگ نہیں کیا۔ جیل کے حکام نے کمسن ملزمان کو بڑوں سے علیحدہ بیرکوں میں رکھا۔ بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قائم تنظیم کے مطابق، قیدی بچے دیگر قیدیوں اور جیل عملہ کی جانب سے بدسلوکی اور زیادتی کا شکار بنتے ہیں۔

اگرچہ اسلام آباد ہائی کورٹ نے کووڈ وبا کے باعث بعض قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ کیا تاہم سپریم کورٹ نے تیس مارچ کو وہ فیصلہ کالعدم قرار دے کر قیدیوں کی رہائی روک دی۔

انتظامیہ: زیر حراست افراد کے امور کی نگرانی کے لیے ایک محتسب کا دفتر اسلام آباد میں اور ذیلی دفاتر ہر صوبہ میں تھے۔ جیل خانہ جات کے انسپکٹرز جنرل نے بے قاعدگی کے ساتھ جیلوں اور زیر حراست مراکز کا دورہ کیا تاکہ صورتحال کو جانچا جاسکے اور شکایات کا ازالہ کیا جاسکے۔

قانون کے مطابق جیل کے حکام پر یہ لازم ہے کہ وہ قیدیوں اور زیر حراست افراد کی جانب سے تحریر کی گئی شکایتیں بغیر سنسر کے عدالتی حکام تک پہنچائیں اور ان سے غیر انسانی صورتحال کے حوالے سے لگائے گئے قابل اعتبار الزامات کی تفتیش کی درخواست کر سکیں۔تاہم اس قسم کی اطلاعات موصول ہوئیں کہ قیدیوں نے جیل حکام کی جانب سے انتقامی کارروائی کے خوف سے اپنی شکایات جمع کرانے سے احتراز کیا۔ قانون کے مطابق قیدیوں سے ملاقات کی جاسکتی ہے مگر رش اور بعض جیلوں میں ملاقاتیوں کے لئے سہولیات کی عدم فراہمی کی وجہ سے قیدی اپنے ملاقاتیوں سے ملنے کے حوالے سے شدید پابندیوں کا شکار رہے۔ زیادہ تر مواقع پر جیل حکام نے قیدیوں کو اپنی مذہبی روایات کی پاسداری کی اجازت فراہم کی۔

کروناوائرس وباء کے دوران صوبائی اعلیٰ عدالتوں کے احکامات پر مجموعی طور پر ۵۴۸ (سندھ میں ۵۱۹ جبکہ پنجاب میں ۲۹) کم درجہ کے جرائم میں قید افراد کو رہا کر دیا گیا۔

آزادانہ نگرانی: جیلوں کی صورتحال کی نگرانی پر مامور بین الاقوامی تنظیموں نے بعض حراستی مراکز تک رسائی کے حوالے سے اپنی مشکلات کا اظہار کیا خاص کر ان مراکز تک جہاں سلامتی اُمور سے متعلق قیدی نظر بند تھے۔حکام نے بین الاقوامی تنظیموں کو خیبر پختونخوا، سابقہ فاٹا اور بلوچستان میں تشدد آمیز واقعات سے متاثرہ علاقوں میں حراستی مراکز تک رسائی کی اجازت نہیں دی۔حکام نے مقامی، صوبائی اور قومی سطح پر انسانی حقوق کی تنظیموں اور صحافیوں کو جیلوں میں قید بچوں اور عورتوں کے حالات کا معائنہ کرنے کی اجازت دی۔

اصلاحات: گزشتہ سال کے دوران پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخوا کے محکمہ ہائے جیل خانہ جات نے حوالات کے جدید انتظام و انصرام، بشمول انسانی حقوق کی پاسداری کے فروغ اور انتہاپسندی کے خاتمہ پر مرکوز تربیت گاہوں کی تعمیر جاری رکھی۔

د) جبری حراست یا گرفتاری

قانون اندھا دھند گرفتاری یا حراست میں لیے جانے کی ممانعت کرتا ہے اور فرد کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنی گرفتاری یا حراست کے جواز کو عدالت میں چیلنج کرے، لیکن حکام عام طور پر ان قواعد وضوبط کی پاسداری نہیں کرتے۔ بدعنوانی اور سزا کے خوف سے مبرا ہونے کے باعث مسئلہ مزید گھمبیر ہو جاتا ہے۔

خیبر پختونخوا حکومت کا نافذ کردہ امدادی اقدامات برائے سویلین اختیارات آرڈیننس مجریہ ۲۰۱۹ء فوج کو صوبہ بھر میں سولین افراد کو بغیر فرد جرم آرمی کیمپوں میں قید، ملکیت پر قبضہ، عسکری کارروائیاں اور ایک فوجی اہلکار کے شخصی حلف نامہ کو بنیاد بنا کر سزا دینے کا استحقاق فراہم کرتا ہے۔ آرڈیننس منظوری کے قبل ازاور بعد ازاں فوج کو صوبہ میں بوجہ اپنے اقدامات سویلین عدالتوں میں قانونی جوابدہی سے استثنیٰ حاصل رہا۔ آرڈیننس یہ بھی صادر کرتا ہے کہ فوج زیرِ حراست افراد کے نام ان کے خاندانوں کے سامنے ظاہر کرنے کی پابند نہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رشتہ دار اپنے پیاروں کی حراست کو سول عدالت میں چیلنج نہیں کر سکتے۔ ایک صوبائی اپیل کورٹ ے آرڈیننس کو غیر آئینی قرار دیا لیکن سپریم کورٹ نے صوبائی عدالت کی رولنگ معطل کر دی۔ اپیل سپریم کورٹ کے پاس زیرِالتوا ہونے کی وجہ سے سابقہ فاٹا کے زیادہ تر علاقوں میں حراستی مراکز اور قانون نافذ کرنے والی سرگرمیوں کا کنٹرول فوج نے سنبھالا ہوا ہے۔

۲۰ جولائی کو سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ قومی احتساب بیورو (نیب) نے حزبِ اِختلاف کے دو رہنمائوں خواجہ سعد رفیق اور خواجہ سلمان رفیق کی گرفتاری میں شفاف پیروی اور منصفانہ قانونی طریقہ ہائے کار کے حق کی پامالی کی ہے۔ دونوں رہنمائوں کو نیب نے پندرہ ماہ تک ٹھوس اسباب کے بغیر زیر حراست رکھا۔

۱۲ مارچ کو نیب نے ملک کے سب سے بڑے نشریاتی ادارے جنگ کے ایڈیٹر ان چیف اور مالک میر شکیل الرحمان کو ملکیت سے متعلق ۳۴ سال پرانی لین دین کے معاملہ میں لاہور سے گرفتار کیا۔ اے پی این ایس نے گرفتاری کی مذمت کرتے ہوئے اس کو حکومت کی جانب سے آزاد میڈیا کو خاموش کرانے کی سازش قرار دیا۔ جون میں اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ برائے انسداد صوابدیدی حراست نے حکومت سے میر شکیل الرحمان کی گرفتاری کے قانونی بنیادوں کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کا مطالبہ کیا اور یہ سوال بھی اُٹھایا کہ ۳۴ سال پرانے مبینہ جرم پر کارروائی اب کیوں کی گئی ہے۔ شکیل الرحمٰن کو ۹ نومبر کے دن ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔

اکتوبر ۲۰۱۹ء میں وفاقی تحقیقاتی ادارے (ایف آئی اے) کے اہلکاروں نے انسانی حقوق کی کارکن اور ملکی فوج کی ناقد گلالئی اسماعیل کے والد محمد اسماعیل کو حراست میں لیا تھا۔ ایجنسی کے مطابق محمد اسماعیل کو فیس بک اور ٹوئیٹر پر سرکاری اداروں کے خلاف غلط معلومات کی تشہیر اور شر انگیز تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ اگرچہ انسداد دہشتگردی عدالت نے بعد ازاں دو جولائی کو گواہی کی عدم دستیابی کی بنیاد پر سوشل میڈیا اور انسانی حقوق کارکن گلالئی اسماعیل اور اُس کے والدین کے خلاف دہشتگری کی مالی معاونت کے الزامات مسترد کر دیے تھے تاہم گلالئی کے والد نے دو اکتوبر کو اعلان کیا کہ اُن کے خلاف نئے الزامات عائد کر دیے گئے ہیں۔

گرفتاری کا طریقہ ہائے کار اور زیر حراست افراد سے سلوک

ایف آئی آر کسی بھی گرفتاری کی قانونی بنیاد ہوتی ہے اور یہ اس وقت شروع ہوتی ہے جب پولیس کو کسی قابل دست اندازی جرم کی اطلاع ملتی ہے۔ عام طور پر ایک تیسرا فریق ایف آئی آر کا اندراج کراتا ہے، تاہم پولیس بھی اپنے طور پر ایف آئی آر درج کر سکتی ہے۔ ایف آئی آر کی بنیاد پر پولیس کسی مشتبہ شخص کو چوبیس گھنٹے کے لیے حراست میں لے سکتی ہے، جس کے بعد مجسٹریٹ مزید ۱۴ روز کی حراست کا حکم دے سکتا ہے بشرطیکہ پولیس یہ ثابت کرے کہ معاملہ کی چھان بین کے لیے شواہد درکار ہیں۔ بعض حکام حراست کی اس پابندی کا اہتمام نہیں کرتے۔ حکام مبینہ طور پر معاون شواہد کے بغیر ایف آئی آر درج کر لیتے ہیں تاکہ زیر حراست افراد کو خوف و ہراساں کریں یا کافی شواہد کی موجودگی میں بھی اس وقت تک ایف آئی آر درج نہیں کرتے جب تک وہ مدعی سے رشوت نہ وصول کر لیں۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ لوگوں کو بغیر عدالتی اجازت کے گرفتار کیا گیا اور قیدیوں سے ملاقات کے لیے رشوت دینا پڑی۔

وزارت خارجہ نے غیر ملکی باشندوں کی گرفتاری کے متعلق اطلاع باضابطہ طور سفارتخانوں اور قونصل خانوں کو فراہم کرنے کی ذمہ داری نہیں نبھائی۔ حکومت نے غیر ملکی مشنز کو پابند کیا ہے کہ وہ اپنے زیر حراست باشندوں تک رسائی کے لیے بیس دن قبل درخواست دیں۔ کئی غیر ملکی مشنوں نے اطلاع دی کہ زیر حراست باشندوں تک رسائی کی درخواستیں ہفتوں بلکہ مہینوں تک زیر التواء رہتی ہیں اور اگر جواب آئے بھی تو رسائی کا اجازت نامہ متوقع دورے سے ایک دن قبل تک بھی جاری نہیں کیا جاتا۔ غیر ملکی قیدی اپنی قید مکمل کرنے کے بعد بھی جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں کیونکہ وہ ملک بدری کے لیے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔

قیدیوں کی رہائی کے لیے ضمانتوں کا ایک باقاعدہ نظام موجود ہے۔ تاہم انسانی حقوق کے گروہوں نے نوٹ کیا کہ متعدد بار جج رشوت کی وصولی تک ضمانت پر رہائی منظور نہیں کرتے۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاع دی کہ حکام توہین رسالت کے مقدمات میں اس بنیاد پر ضمانت منظور نہیں کرتے کہ مدعاعلیہ جسے سزائے موت کا سامنا ہوتا ہے فرار ہو جائے گا یا لوگوں کے غیض وغضب کا شکار ہو جائے گا۔ وہ مدعاعلیہ جو کم تر درجے کے توہین رسالت الزامات کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں، ان پر ساتھ ساتھ دہشت گردی کے الزامات بھی عائد کر دیے جاتے ہیں جو کہ ناقابل ضمانت ہوتے ہیں۔ غیر سرکاری تنظیموں نے یہ بھی اطلاعات دیں کہ وہ وکلاء جو توہین رسالت کے ملزمان کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں اپنے موکلان کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ زیر حراست رہیں تاکہ لوگوں کے غیض وغضب سے محفوظ رہ سکیں۔

قانون کی رُو سے زیر حراست افراد کو گرفتاری کے تیس دنوں کے اندر اندر مقدمہ کی کارروائی کے لیے پیش کرنا لازم ہے۔ چند استثنایات یہ ہیں: ڈسٹرکٹ کوآرڈی نیشن آفیسر "امن وامان" برقرار رکھنے کے لیے ۹۰ دن تک زیر حراست رکھنے کا مجاز ہے اور یہ مدت محکمہ داخلہ کی منظوری سے مزید ۹۰ دنوں تک بڑھائی جاسکتی ہے۔

حکومت سزائے موت جیسے جرائم کا سامنا کرنے والے قیدیوں کو سرکاری خرچے پر قانونی مشاورت فراہم کرتی ہے لیکن یہ قانونی سہولت معمول کے دیگر کیسوں میں میسر نہیں کی جاتی ہے۔ آئین حبسِ بے جا کے خلاف حق کو تسلیم کرتا ہے اور ہائی کورٹس کو اختیار دیتا کہ وہ زیر حراست مشتبہ شخص کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیں۔ قانون شہریوں کو اجازت دیتا کہ وہ حبس بے جا کی درخواستیں عدالتوں میں دائر کریں۔ جبری گمشدگیوں کے متعدد کیسوں میں سرکاری حکام ججوں کے حکم پر زیر حراست افراد کو عدالت میں پیش کرنے میں ناکام رہے۔

بعض واقعات میں پولیس نے زیرِ حراست افراد کو نامعلوم مدت تک قید تنہائی میں رکھا۔

اندھا دھند پکڑ دھکڑ: ایسی اطلاعات تھیں کہ پولیس اندھا دھند افراد کو گرفتار کرلیتی ہے تاکہ اُن سے رہائی کے عوض رشوت وصول کی جائے یا مطلوب ملزمان کے رشتہ داروں کو پکڑ لیتی ہے تاکہ ان ملزمان کو گرفتاری دینے کے لیے مجبور کیا جاسکے۔ کراچی میں اقلیتوں اور پناہ گزینوں، جن کے پاس شناخت کی سرکاری دستاویزات نہیں ہوتیں، اطلاع دی کہ پولیس اہلکار انہیں زبردستی پکڑ لیتے ہیں اور ہراساں کرتے ہیں۔ یہ خبریں بھی عام ہیں کہ پولیس، بشمول بارڈر کنٹرول، جرائم کی تفتیش، انسداد جاسوسی اور سلامتی کے ذمہ دار ادارہ- فیڈرل انوسٹی گیشن ایجنسی- کے اہلکار رشوت وصول کرنے کے لیے پکڑ دھکڑ کرتے ہیں۔

گرفتاری قبل از سماعت مقدمہ: صوبائی جیل حکام کے مطابق اگست تک کے اعداد و شمار کے مطابق ۶۸ فیصد قیدی اپنے مقدمات شروع ہونے کے منتظر تھے یا پھر پیشیاں بھگت رہے تھے۔ اطلاعات کے مطابق جیل حکام اعدادوشمار جمع کرنے کے سلسلہ میں مقدمات شروع ہونے کے منتظر اور زیر التواء مقدمات کے قیدیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ پولیس بسااوقات افراد کو مجسٹریٹ کی منظوری کے بغیر تفتیش کے لیے لوگوں کو حراست میں لے لیتی ہے اور انہیں بغیر کسی الزام کے قید میں رکھتی ہے حتیٰ کہ وہ حراست عدالت میں چیلنج ہو جاتی ہے۔ مجسٹریٹس بھی عام طور پر پولیس کی درخواست پر بغیر کسی جواز کے تفتیش کی غرض سے کی جانے والی گرفتاری کی منظوری دے دیتے ہیں۔ پولیس جب ۱۴ دن کے اندر مشتبہ شخص کے خلاف مناسب شواہد جمع کرنے میں ناکام رہتی ہے تو وہ عام طور پر مجسٹریٹس سے نیا دوبارہ ریمانڈ دینے کی درخواست کرتی ہے تاکہ مشتبہ شخص کی حراست کی مدت کو طول دیا جاسکے۔

بعض افراد کی مقدمے کی سماعت سے قبل حراست کی مدت تو اس جرم میں زیادہ سے زیادہ سزائے قید سے بھی بڑھ گئی جس کا ان پر الزام تھا۔ حکام شاذونادر ہی زیر حراست افراد کو فوری طور پر انہیں ان الزامات کے بارے میں بتاتے ہیں جن میں گرفتار کیا گیا ہوتا ہے۔

انسداد بدعنوانی کے مقدمات کی تفتیش اور پیروی کے ذمہ دار ادارے قومی احتساب بیورو (نیب) کی جانب سے عدالت میں لائے گئے مقدمات پر خصوصی قواعد وضوابط کا اطلاق ہوتا ہے۔ نیب مشتبہ شخص کو بغیر الزام عائد کئے پندرہ دنوں کے لئے حراست میں رکھ سکتا ہے (اس مدت کی عدالت کی اجازت سے تجدید کی جاسکتی ہے) اور فرد جرم عائد کرنے سے پہلے وکیل تک رسائی سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے۔ نیب کے دائرہ کار میں آنے والے جرائم قابل ضمانت نہیں ہیں اور صرف نیب کا چیئرمین ہی اس بات کا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے کہ آیا زیر حراست افراد کو رہا کیا جائے۔

سیکورٹی فورسز مشتبہ دہشت گردوں کی سرگرمیوں کو محدود کرسکتی ہیں، ان کے اثاثے ۴۸ گھنٹوں تک اپنی تحویل میں لے سکتی ہیں اور بغیر کسی الزام کے ایک سال تک حراست میں رکھ سکتی ہیں۔ انسانی حقوق اور بین الاقوامی تنظیموں نے اطلاع دی ہے کہ سکیورٹی فورسز نے کئی افراد کو، جن کی تعداد معلوم نہیں، ان کے دہشت گردوں سے مبینہ تعلقات کی بنیاد پر، غیر معینہ مدت کے لیے

حراست میں رکھا ہوا ہے، جہاں ان پر تشدد کیا جاتا ہے اور بد سلوکی بھی روا رکھی جاتی ہے۔ متعدد کیسوں میں قیدیوں کو قید تنہائی میں رکھا گیا ہے اور انہیں اپنی مرضی کے وکیل تک فوری رسائی بھی نہیں دی گئی۔ ان کے اہل خانہ کو بھی ان سے فوری طور پر ملنے کی اجازت نہیں ہے۔

زیر حراست افراد کا اپنی گرفتاری کے جواز کو عدالت چیلنج کرنے کا حق: ایسی اطلاعات ملیں کہ زیر حراست افراد یا قیدیوں کو اپنی گرفتاری کو عدالت میں چیلنج کرنے، انصاف حاصل کرنے یا ہرجانہ وصول کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ہ) منصفانہ عوامی عدالتی کاروائی کے حق سے انکار

قانون ایک خود مختار عدلیہ کی موجودگی کی ضمانت فراہم کرتا ہے لیکن غیر سرکاری تنظیموں اور ماہرین قانون کے مطابق عدلیہ اکثر اوقات بیرونی دباؤ کے تحت ہوتی ہے جیسا کہ دہشتگردی اور توہین مذہب کے کیسوں میں انتہا پسندوں کی جانب سے انتقام کا خوف اور بڑے مقدمات کو عوامی طور پر سیاسی رنگ دینے کی روش۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں نے اطلاع دی کہ جج حضرات توہین مذہب کے کیسوں میں ملزمان کو عوامی تشدد کے خدشہ کے پیش نظر بری کرنے میں تامل کرتے تھے۔ میڈیا اور عام لوگ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ پر بھروسہ کرتے ہیں، تاہم ذرائع ابلاغ نے ان عدالتوں کے ججوں پر سلامتی اداروں کے دباؤ کے الزامات کے بارے میں بات کی ہے۔

ماتحت اور اعلیٰ عدالتوں میں بڑے پیمانے پر پرانے زیر التواء کیسوں کی بھرمار سے موثر ازالے اور جائز عام سماعت کا حق متاثر ہوتا ہے۔ قبل از سماعت گرفتاری کی روایت کی بوجہ فوجداری مقدمات کے ملزموں کو طویل عرصہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ازکار رفتہ قواعد وضوابط، ججوں کی خالی اسامیاں، مقدمات کا غیر معیاری انتظام اور کمزور قانونی تعلیم دیوانی اور فوجداری مقدمات میں تاخیر کا باعث بنتی ہیں۔ قومی عدالتی پالیسی ساز کمیٹی کے مطابق ملک کے عدالتی سرشتہ میں بیس لاکھ سے زیادہ مقدمات پھنسے پڑے ہیں۔

وزارتِ قانون وانصاف کے مطابق ماہ نومبر میں اُنیس لاکھ دیوانی مقدمات زیر التوا تھے۔ گذشتہ دو سالوں میں وزارت نے متبادل تصفیہ نظام (اے ڈی آر) کے تحت عائلی قوانین کے متعدد مقدمات سمیت چار لاکھ پچاس ہزار مقدمات نمٹائے۔روایتی طور پر کوئی بھی دیوانی تنازعہ حل ہونے میں دس سال کا دورانیہ صرف ہو سکتا ہے تاہم اے ڈی آر سرشتہ یہ مدت تین سے پانچ ماہ کر سکتا ہے۔

بہت سی ماتحت عدالتیں بدستور بدعنوان، نااہل رہیں اور دولت مند افراد اور بارسوخ مذہبی اور سیاسی شخصیات کے دباؤ کا شکار تھیں۔

اعلیٰ سطح کے مقدمات میں نامعلوم افراد کی جانب سے مقدمات کے گواہوں، وکیلوں اور تفتیشی پولیس افسران کو دھمکیاں دینے اور قتل کرنے کے واقعات بھی رُونما ہوئے۔

غیر رسمی عدالتی نظام کا، جس میں قانونی ادارے کا تحفظ نہیں ہوتا، استعمال بالخصوص دیہی علاقوں میں، بدستور جاری رہا اور اکثر اوقات انسانی حقوق کی پامالی کی صورت میں نکلا۔ سندھ اور پنجاب میں بڑے بڑے جاگیرداروں اور برادری رہنماؤں اور پختون اور بلوچ علاقوں میں قبائلی قائدین نے کئی بار پنچائت اور جرگے منعقد کئے جو کہ مروجہ قانونی نظام سے باہر ہیں۔ ایسے اجتماعات نے تنازعات حل کرائے اور قبائلی سزائیں دیں جن میں جرمانے، قید و بند اور بعض دفعہ موت کی سزا بھی شامل تھیں۔ ایسے اجتماعات نے اکثر اوقات نام نہاد غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم میں عورتوں کو پُر تشدد سزائیں یا موت کی سزا سنائی۔ مئی میں پنجاب اسمبلی نے لوکل گورنمنٹ ایکٹ اور پنچائت اینڈ ویلیج کاؤنسلز ایکٹ پاس کرتے ہوئے براہ راست منتخب شدہ ٹاؤن کونسلز کو شہری یا محلہ بنیادوں پر قائم پنچائتوں کو آپس میں منسلک کر دیا۔ مذکورہ قانون پنچائت کو اختیار فراہم کرتا ہے کہ وہ ٹاؤن کونسلوں کی جانب سے سپرد کی گئیں عوامی خدمات یا دیگر ذمہ داریاں ادا کر سکتی ہیں۔

ایف آئی جی آر اور فرنٹیئر کرائمز ریگیولیشنز قانونی نظام کے خاتمہ کے باوجود سابقہ فاٹا میں ایسے جرگوں کا انعقاد عام روایت ہے۔ سپریم کورٹ کی جانب سے جرگوں اور پنچائت نظام کو غیر آئینی قرار دینے کے بعد عدالت نے انصاف کی فراہمی کے نام نہاد غیر رسمی سرشتوں کی جانب سے دیوانی تنازعات میں فریقین کے درمیان صوابدید، ثالثی، مذکرات اور مفاہمت کرانے کے اختیارات پر بندش عائد کر دی۔

مقدمات کی سماعت کا طریقہ کار

دیوانی، فوجداری اور فیملی کورٹ کے نظاموں میں انصاف پر مبنی مقدمات کی سماعت کا طریقہ کار موجود ہے جس میں ملزم جرم ثابت ہونے تک بے گناہ تصور کیا جاتا ہے، جرح اور اپیل کا طریقہ کار موجود ہے۔ آئین ملزم کو شخصی حلف کے ذریعہ جرم قبول کرنے سے تحفظ دیتا ہے۔ جیوری کے ذریعہ مقدمات کی سماعت کا نظام نہیں۔ اگرچہ مدعاعلیہ کو سماعت کے دوران موجود رہنے اور وکیل سے مشاورت کا حق ہے، عدالتیں سزائے موت کا سامنا کرنے والے نادار قیدیوں کے لیے سرکاری وکیل مقرر کرتی ہیں۔

مدعاعلیہ عام طور پر ماتحت عدالتوں میں وکیلوں کی فیس برداشت کرتے ہیں، لیکن اپیلٹ کورٹس میں سرکاری خرچ پر وکیل کی خدمات مہیا کی جاسکتی ہیں۔ مدعاعلیہ استغاثہ کے گواہوں سے جرح کر سکتا ہے اور اپنے گواہ اور شواہد پیش کر سکتا ہے۔ ججوں کی محدود تعداد کے باعث زیرالتواء مقدمات کی بھرمار، طویل عدالتی طریقہ کار، بار بار التواء اور سیاسی دباؤ کی وجہ سے کیس عام طور پر برسوں چلتے رہتے ہیں اور مدعاعلیہ کو بار بار عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔

پولیس بچوں کے جرائم سے مناسب طریقے سے نمٹنے کی تربیت سے عاری ہیں اور پولیس کے ہاتھوں نوعمر قیدیوں پر تشدد کی اطلاعات بھی موجود تھیں۔ بہت سے نوعمر قیدیوں نے اپنی مدت قید سے زیادہ وقت سلاخوں کے پیچھے گزارا کیونکہ وہ ضمانت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک این جی او کے مطابق عدالتی نظام بشمول حراستی مرکز کی جانب منتقلی میں شامل ہوتے ہی نابالغ قیدی پولیس، بالغوں اور دیگر نابالغ قیدیوں کی جانب سے جنسی اور جسمانی حملے کے خطرات سے دوچار ہوتے ہیں۔ نابالغ قیدیوں کو گرفتار بالغ افراد سے علیحدہ سہولیات میسر نہیں۔

قانون نابالغ قیدیوں کے لیے جووینائل کورٹس اور جووینائل جسٹس کمیٹیز تشکیل دینے کا اختیار دیتا ہے تاکہ معمولی جرائم میں ملوث نوعمر قیدیوں کو باقاعدہ عدالتوں میں لے جائے بغیر مقدمات کا فیصلہ کیا جائے۔ حکومت کو مذکورہ عدالتوں اور کمیٹیوں کے تین ماہ میں قیام کی ہدایتوں کے باوجود اُن کا اطلاق سست روی کا شکار تھا۔ اکتوبر تک کی دستیاب معلومات کے مطابق حکومت بچوں کے لئے لاہور میں تین اور خیبر پختونخوا میں سابقہ فاٹا سمیت تین عدالتیں قائم کر چکی تھی۔

قانون بچوں کو سزائے موت دینے پر پابندی عائد کرتا ہے لیکن انسداد دہشت گردی ایکٹ کے زمرے میں آنے والے مقدمات میں کمسن افراد کو بھی سزائے موت سنائی گئی۔ مزید براں دستاویزات کی عدم موجودگی کے باعث نوعمر ملزمان کی عمر کا تعین کا مسئلہ درپیش رہا۔

عدالتی مقدمات میں شفافیت کی کمی کے واقعات سامنے آئے، بالخصوص جب کسی مقدمہ میں کوئی بڑی شخصیت ملوث ہو یا پھر حساس معاملات جیسا کہ توہین مذہب کا معاملہ درپیش ہو۔ غیر سرکاری تنظیموں نے اطلاعات دیں کہ حکومت اکثر اوقات ایسے مقدمات کی سماعت مدعاعلیہ، وکلاء، ججوں، استغاثے کے وکیل اور عینی شاہدین کے تحفظ کی خاطر جیل کے اندر کرتی ہے۔ اگرچہ سلامتی کے یہ خدشات جائز ہیں لیکن غیر سرکاری تنظیموں نے جیلوں میں سماعت میں عدم شفافیت پر تشویش کا اظہار کیا۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ حکومت کو دہشتگردی کی سرگرمیوں اور فرقہ ورانہ تشدد میں ملوث افراد کے مقدمات کو انسداد دہشت گردی کی خصوصی عدالتوں میں چلانے کی اجازت دیتا ہے۔ دیگر عدالتوں میں مشتبہ افراد کو گرفتاری کے سات دنوں کے اندر اندر پیش کیا جاتا ہے لیکن انسداد دہشت گردی کی عدالتیں یہ مدت بڑھانے میں آزاد ہیں۔ انسانی حقوق کے کارکنوں نے اس متوازی نظام پر نکتہ چینی کی کہ یہ سیاسی سازباز اور جوڑ توڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔ حکام نے مقدمات کے جلد از جلد نمٹانے کے لیے اُن کیسوں کو انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کو منتقل کرنے کا سلسلہ، اگرچہ ان کا دہشت گردی سے تعلق نہ ہونے کے باوجود، جاری رکھا۔ دہشتگردی سے غیر متعلقہ مقدمات، بشمول توہین مذہب اور مذہبی منافرت کے فروغ کا باعث تصور کردہ واقعات، کے تصفیہ کے لیے

انسداد دہشت گردی کی عدالتوں کا بار بار استعمال مقدمات کے انبار کا سبب بنتا ہے اور معمول کے عدالتی نظام کی نسبت تیز ہونے کے باوجود انسداد دہشت گردی کی عدالتیں سرسری سماعت کے پیمانے پر پورا اترنے میں اکثر اوقات کامیاب نہ ہو سکیں۔

فیڈرل شریعت کورٹ عام طور پر حُدود آرڈیننس کے تحت نمٹائے جانے والے مقدمات پر نظرثانی کرتی ہے۔ یہ قانون فوجی حکمران محمد ضیاء الحق نے ۱۹۷۹ء میں نافذ کیا تھا تاکہ غیر ازدواجی جنسی تعلق، قذف (غیر ازدواجی جنسی تعلق کا جھوٹا الزام)، چوری اور شراب نوشی کے جرائم کے خلاف اسلامی سزاؤں کی سخت تشریح کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ وفاقی شریعت کورٹ کو اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی قانون کو اسلامی احکامات سے متصادم قرار دے کر نظرثانی کر سکتی ہے۔ شہری شرعی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف سپریم کورٹ کے شریعت اپیلٹ بینچ میں اپیل کر سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ کا ایک فُل بینچ مزید اپیل سن سکتا ہے۔

سول سوسائٹی تنظیموں کے مطابق عدالتیں اکثر اوقات توہین مذہب کے مقدمات میں مذہبی اقلیتوں کو الزام لگانے والے مسلمان شہریوں سے تحفظ دینے میں ناکام رہیں۔ اعداد و شمار کے تجزیہ کے مطابق توہین مذہب کے الزام میں زیر حراست ملزمان کی اکثریت مسلمان تھی تاہم آبادی کا کم حصہ ہونے کی شرح سے مذہبی اقلیتیں بھی غیر متوازن انداز میں متاثر ہوئیں۔ ذیلی عدالتیں توہینِ مذہب کے مقدمات میں گواہی کے بنیادی معیار کی پاسداری میں ناکام رہیں، جس کی وجہ سے اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے سزائیں کالعدم ہونے یا رہائی کے احکامات کی آتے آتے متعدد ملزمان نے اپنی قیمتی زندگی کے کئی برس جیلوں میں بِتائے۔

بعض مقدمات میں پولیس نے توہین مذہب یا مذہبی منافرت کے پُر تشدد واقعات کے بعد لوگوں کو گرفتار کیا۔ ستمبر میں سندھ کے شہر گھوٹکی میں ہندو استاد پر توہین رسالت کے الزامات کے رد عمل میں ہندوؤں کے مندروں اور جائیدادوں پر حملوں کے واقعات میں ملوث سات افراد کو پولیس نے حراست میں لیا۔

اس حوالہ سے مزید جاننے کے لیے محکمہ خارجہ کی بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ مندرجہ ذیل لنک پر ملاحظہ کیجیے:

https://www.state.gov/religiousfreedomreport

سیاسی قیدی اور اسیران

نیب نے حزبِ اِختلاف کی شخصیات کے خلاف بدعنوانی کے الزامات کا دباؤ جاری رکھا۔ پی ٹی آئی کی سیاسی شخصیات کے خلاف اُسی نوعیت کے الزامات کی چھان بین شاذ ونادر ہی کی گئی۔ ۲۸ ستمبر کو اہلکاروں نے پاکستان مسلم لیگ نواز (پی ایم ایل۔ن) کے صدر اور قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف شہباز شریف کو آمدنی ذرائع سے زیادہ اثاثے بنانے اور منی لانڈرنگ کے الزام میں گرفتار کیا۔

۲۰ جولائی کو سپریم کورٹ نے فیصلہ جاری کرتے ہوئے انسداد بدعنوانی کے ادارے نیب کی جانب سے مسلم لیگ نون کے رہنما بھائیوں خواجہ سعد اور سلمان رفیق کو ۱۴ ماہ قید رکھنے کی کارروائی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ عدالت عظمیٰ نے نیب پر جرم ثابت ہونے سے قبل بے قصور ہونے کے اُصول کی پامالی کا الزام عائد کیا اور کہا کہ حزب اختلاف کے سیاستدانوں کو بنا سبب گرفتار اور حکومت کے اتحادیوں کو بڑے گھپلوں کے باوجود چھوڑ کر نیب سیاست میں مداخلت کر رہا ہے۔

بعض لسانی اور مذہبی گروہوں نے دعویٰ کیا کہ کہ حکام نے سیاسی وابستگی اور عقائد کی بنیاد پر ان کے ارکان کو گرفتار کیا۔ ۲۰۰۹ء کے آغاز حقوق بلوچستان اصلاحاتی پیکیج کے تحت حکومت نے ان تمام بلوچ سیاسی قیدیوں، رہنماؤں اور کارکنوں کیلئے، جو جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے یا ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھے، عام معافی کا اعلان کیا تھا۔ عام معافی کی پیشکش کے باوجود بلوچ رہنماؤں کی غیر قانونی گرفتاریوں اور بلوچ عام شہریوں کی گمشدگیوں کا سلسلہ جاری رہا۔

بلوچستان میں گمشدہ افراد کے بارے میں وفاقی تحقیقاتی کمیشن نے دعویٰ کیا کہ مارچ ۲۰۱۱ء سے مارچ ۲۰۲۰ء کے درمیان رپورٹ ہونے والے ۴۸۳ مقدمات میں سے صرف ۱۶۴ مقدمات زیرالتویٰ ہیں۔ لیکن انسانی حقوق کے کارکنوں نے کہا کہ کمیشن کے اعداد و شمار ناقابل بھروسہ ہیں اور گمشدہ افراد کی تعداد رپورٹ ہونے والے واقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ جون میں بلوچستان نیشنل پارٹی مینگل (بی این پی۔ایم) نے گمشدہ بلوچ کارکنوں کی بازیابی سمیت وعدوں کی تکمیل نہ ہونے پر وزیراعظم عمران خان کے اتحادی دھڑے سے علیحدگی اختیار کی۔ بی این پی ایم نے دعویٰ کیا کہ ۲۰۱۸ء سے لیکر گمشدہ ۵ ہزار ۱۲۸ میں سے صرف ساڑھے چار سو افراد ہی

بازیاب ہوئے ہیں جبکہ مزید ۱۸۰۰ لاپتا ہوئے ہیں۔ سندھ میں غیر سرکاری تنظیم وائس فار مسنگ پرسنس آف سندھ نے دعویٰ کیا کہ ۸۳ لوگ، جن میں زیادہ تر قوم پرست سیاسی پارٹیوں کے کارکن ہیں، اپنی سیاسی وابستگیوں کی وجہ سے سلامتی اداروں کی تحویل میں ہیں۔

بیرون ملک مقیم افراد کے خلاف سیاسی بنیادوں پر انتقام

یورپ میں جلاوطن صحافیوں نے اطلاع دی کہ فوج کی کارروائیوں اور انسانی حقوق کی پامالیوں کی تحقیقات کرنے کی پاداش میں اُن کو ہراساں کیا گیا اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

ضابطہ دیوانی اور تدارک

شہری انسانی حقوق کی مختلف اقسام کی خلاف ورزیوں کے ازالے کیلئے عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں اور عدالتیں اکثر ایسے معاملات پر کارروائی کرتی ہیں۔ لوگ حکومتی اہلکاروں کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی دادرسی کیلئے دیوانی عدالتوں کی مدد لے سکتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق دیوانی عدالتوں نے شاذونادر ہی ایسے مقدمات پر باقاعدہ فیصلے کئے اور زیادہ تر مقدمات عدالت سے باہر ہی حل کر لئے گئے۔ اگرچہ انتظامی سطح پر شکایات کے ازالے کا کوئی طریقہ کار موجود نہیں تھا لیکن اس حوالے سے غیر رسمی طریقے عام تھے۔ افراد اور تنظیمیں مخالفانہ فیصلوں کے خلاف انسانی حقوق کی تنظیموں کے ہاں اپیل نہیں کر سکے اگرچہ چند غیر سرکاری تنظیموں نے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کو انسانی حقوق کے حوالے سے اپنی "متبادل رپورٹیں" ضرور پیش کیں۔

و) چادر اور چہار دیواری یا خط و کتابت میں من مانی یا غیر قانونی مداخلت

کسی بھی جگہ یا ملکیت کی تلاشی کے لیے عدالتی وارنٹ کی موجودگی قانونی تقاضا ہے لیکن پولیس نے اکثر اوقات اس شرط کو نظرانداز کیا اور بعض مواقع پر تلاشی کے دوران اشیاء چرالیں۔ حکام کی جانب سے غیر قانونی داخلے پر پولیس کو شاذونادر ہی سزا دی گئی۔ بعض دفعہ کسی مشتبہ شخص کو گرفتاری پر مجبور کرنے کیلئے پولیس نے اس کے خاندان کے افراد کو پکڑ لیا۔ انسداد دہشتگردی

قانون کے دائرے میں آنے والے کیسوں کے سلسلے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اضافی اختیارات حاصل ہو گئے جن میں کسی عدالتی اجازت نامے کے بغیر تلاشی اور ضبطگی بھی شامل ہے۔

متعدد ملکی خفیہ ادارے سیاستدانوں، سیاسی کارکنوں، مشتبہ دہشتگردوں، این جی اوز، غیر ملکی اداروں کے ملازمین اور شعبہ صحافت سے وابستہ لوگوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ ان خفیہ اداروں میں انٹر سروسز انٹیلی جنس، پولیس اسپیشل برانچ، انٹیلی جنس بیورو اور ملٹری انٹیلی جنس شامل تھے۔ باوثوق اطلاعات کے مطابق حکام نے عدالت کی اجازت کے بغیر باقاعدہ طور پر وائر ٹیپ استعمال کئے، سیل فون مانیٹر کئے، برقی خط و کتابت پکڑی اور عدالت کی اجازت کے بغیر ڈاک کو کھولا۔

حکومت نے ٹیکنالوجی اور دیگر ہتھکنڈے بھی استعمال کیے، جن میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر ضابطہ، ویب سائیٹس اور سوشل میڈیا کو بلاک یا چھان بین کرنا، مواد کی نشر و اشاعت پر بندش اور صارفین کا آن لائن تعاقب شامل تھا۔

ز) اندرونی تنازعات میں بدسلوکیاں

فوجی اور نیم فوجی اداروں نے جنگجوؤں کے محفوظ ٹھکانوں کو ختم کرنے کی غرض سے انسداد شورش پسندی اور انسداد دہشتگردی کے حوالے سے متعدد کارروائیاں کیں۔ فوج کی جانب سے ۲۰۱۷ء میں شروع کیا جانے والا آپریشن ردالفساد سال بھر جاری رہا۔ ردالفساد ملک گیر سطح پر جاری انسداد دہشتگردی مہم ہے جس کا مقصد ۲۰۱۴ء تا ۲۰۱۷ء تک وفاق کے زیر انتظام سابق قبائلی علاقہ جات میں غیر ملکی اور مقامی دہشتگردوں کے خلاف کئے جانے والے آپریشن ضرب عضب کی کامیابیوں کو مستحکم کرنا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے دہشتگرد گروہوں کو کمزور کرنے کی غرض سے ان مشکوک دہشتگردوں اور جتھوں کے ارکان کو گرفتار کیا جنہوں نے مبینہ طور پر جنگجوؤں کو نقل و حمل کے سلسلے میں مدد فراہم کی۔ پولیس نے پورے ملک میں چھاپوں کے دوران ہتھیاروں کے ذخیرے، خودکش جیکٹیں اور منصوبہ بندی میں استعمال کیا جانے والے مواد پکڑا۔ پولیس نے اپنا دائرہ کار قبل ازیں حکومتی عملداری سے باہر علاقوں، بالخصوص بلوچستان میں موجود، علاقوں تک پھیلا دیا، جہاں پر فوجی کارروائیاں معمول بن چکی ہیں اگرچہ ذرائع ابلاغ میں اکثر اُن کا تذکرہ نہیں ہوتا۔

ناقص سیکورٹی انتظامات، سیکورٹی فورسز اور عسکریت پسندوں کے خوف اور بلوچستان اور سابقہ قبائلی علاقوں میں رسائی پر حکومت اور سیکورٹی فورسز کے کنٹرول کے باعث، فوجی بدسلوکیوں کے شکار افراد کو ریلیف پہنچانے میں انسانی تنظیموں اور ایسے واقعات کو رپورٹ کرنے میں صحافیوں کو مشکلات پیش آئیں۔

کراچی میں سیاسی، فرقہ وارانہ، جرائم پیشہ اور لسانی تشدد جاری رہا، تاہم تشدد میں کمی واقع ہوئی اور شہر میں سیکیورٹی آپریشنز سے قبل کی نسبت گینگ وار میں کمی واقع ہوئی۔ اگست ۱۴ کو شیعہ برادری سے تعلق رکھنے والے ٹریفک سپاہی محمد علی رضوی کو مبینہ فرقہ وارانہ حملہ میں قتل کر دیا گیا۔ ۲۲ جولائی کو پولیس نے لشکر جھنگوی کے پانچ عسکریت پسندوں کو گرفتار کیا، جن پر پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر حملوں کی منصوبہ بندی کا الزام تھا۔

ہلاکتیں :ایسی اطلاعات موجود تھیں کہ سرکاری سیکیورٹی فورسز ملک بھر میں مشکوک دہشتگردوں کے خلاف دورانِ آپریشن ماورائے عدالت قتل میں ملوث رہیں۔

سیکیورٹی فورسز اور پولیس کے ہاتھوں متعدد مشکوک دہشتگردوں کے پولیس مقابلہ قتل ہونے کی متعدد میڈیا رپورٹس موجود تھیں۔ ۲۰۱۸ء میں انسداد دہشتگردی کے جعلی مقابلے کے دوران نقیب اللہ محسود کے ماورائے عدالت قتل میں ملوث راؤ انوار کے خلاف مقدمہ کی سماعت سال کے آخر تک جاری تھی۔

بلوچستان میں سیکیورٹی فورسز نے مقدمہ کی سماعت سے قبل مشتبہ دہشتگردوں اور اس کے علاوہ انسانی حقوق کے کارکنوں، سیاستدانوں اور اساتذہ کو غائب کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ بلوچ ہیومن رائیٹس آرگنائیزیشن کے مطابق صرف جولائی کے دوران سات اضلاع میں ۴۵لوگ غائب اور ۱۵ قتل ہوئے۔

مشکوک مجرموں کی پولیس اور فوج کے ساتھ فائرنگ کے تبادلہ میں قتل ہونے کی متعدد اطلاعات وصول ہوئیں۔ مثال کے طور پر انسداد دہشتگردی پولیس نے جولائی ۳۱ کو ملک کے مشرقی علاقہ میں عسکریت پسندوں کے ٹھکانوں پر چھاپے میں علیحدگی پسند بلوچ ریپبلکن آرمی کے پانچ کارندوں کو مار دیا۔

جنگجو اور دہشتگرد گروہوں، بشمول تحریک طالبان پاکستان، لشکر جھنگوی اور داعش صوبہ خراسان نے شہریوں، صحافیوں، مقامی رہنماؤں، فوجیوں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکاروں اور اسکولوں کو نشانہ بنایا اور بم دھماکوں، خودکش حملوں اور تشدد کے دیگر طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے سینکڑوں لوگوں کو ہلاک و زخمی کیا۔ حال ہی میں خیبر پختونخوا میں انضمام ہونے والے اضلاع سمیت صوبہ میں عسکریت پسندوں کے سلامتی اداروں، قبائلی عمائدین اور عام شہریوں پر حملوں کا سلسلہ نہیں تھم سکا۔ بروز دس جنوری کوئٹہ میں خودکش حملہ میں ڈی ایس پی حاجی امان اللہ سمیت پندرہ افراد جاں بحق اور ۲۱ زخمی ہوئے۔ دریں اثنا بروز اٹھارہ مئی بلوچستان ہی کے علاقہ مچ میں بارودی سرنگ کے دھماکہ میں چھ ایف سی اہلکار زخمی ہوئے۔ متحدہ بلوچ آرمی نامی تنظیم نے مذکورہ حملہ کی ذمہ داری قبول کی۔ رپورٹوں کے مطابق دولت اسلامیہ نے بھی ذمہ داری قبول کی تھی۔ ۲۹ جون کو بلوچ لبریشن آرمی کے چار مسلح افراد نے کراچی اسٹاک ایکسچینج پر دھاوا بول کر دو سیکیورٹی گارڈز اور ایک پولیس افسر کو قتل اور سات دیگر لوگوں کو زخمی کیا جبکہ بعد میں خود بھی مارے گئے۔ دس اگست کو ٹی ٹی پی سے علیحدہ ہونے والے گروہ جماعت الاحرار نے چمن میں انسداد منشیات فورس کی گاڑی پر حملے میں پانچ افراد کے قتل اور بیس کو زخمی کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ بلوچستان میں کم شدت کی شورش جاری رہی۔ سلامتی اداروں نے دہشتگرد گروہوں کے خلاف کارروائیوں کے دوران مبینہ طور پر ماورائے عدالت قتل کیے۔

کمسن فوجی: غیر ریاستی جنگجو گروپوں نے بارہ سال کی عمر تک کے لڑکوں کو بھی جاسوسی، لڑائی یا خودکش بمباروں کے طور پر مرنے کیلئے بھرتی کیا۔ جنگجوؤں نے بعض اوقات اکثر ان لڑکوں کے والدین کو رقم دی، ان بچوں کو جنسی اور جسمانی تشدد اور بدسلوکی کا نشانہ بنایا اور انہیں ایسے کام کرنے کا جواز مہیا کرنے کیلئے نفسیاتی جبر کے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ حکومت نے اِن کمسن فوجیوں کی بحالی، تعلیم اور انہیں دوبارہ معاشرے کا حصہ بنانے کیلئے سوات خیبر پختونخوا میں ایک سینٹر فعال رکھا۔

تنازعات سے متعلقہ دیگر مظالم: جنوری میں نامعلوم موٹر سائیکل سوار افراد نے خیبر پختونخوا کے علاقہ صوابی میں انسداد پولیو مہم کی دو خواتین کارکنوں کو قتل کر دیا۔ فروری میں خیبر پختونخوا کے ہی علاقہ کولوچی میں انسداد پولیو مہم کی ویکسین ٹیم کی حفاظت پر مامور ایک پولیس افسر بم حملہ میں جاں بحق ہوا۔

مزید برآں، ٹی ٹی پی نے خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کیلئے اپنی مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے اسکولوں کو نشانہ بنایا اور لڑکوں کے اسکول بھی تباہ کیے، جبکہ جنگجوؤں نے علاقوں تک رسائی فراہم کرنے والی اہم سڑکیں اور سرنگیں بند کر دیں اور مواصلات اور توانائی کی تنصیبات پر حملے کئے جس سے تجارت اور خوراک و پانی کا نظام درہم برہم ہو گیا، اُن کے ردعمل میں کی جانے والی فوجی کارروائیوں نے بھی مقامی شہری آبادیوں کے لیے مزید مشکلات کو جنم دیا۔

سیکشن دوئم: شہری آزادیوں کا احترام، بشمول

الف۔ اظہار رائے کی آزادی، بشمول ذرائع ابلاغ

قانون پریس و ذرائع ابلاغ سمیت سب کو اظہار رائے کی آزادی کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس پر آئینی حُدود نافذ ہیں۔ علاوہ ازیں دھمکیوں، خوف و ہراس، تشدد اور ہلاکتوں نے صحافیوں اور مدیروں کو از خود سینسر شپ پر مجبور کر دیا۔ انسانی حُقوق کے کارکنوں اور

پُرامن مظاہرین پر حملوں کی تفتیش اور ذمہ داروں کے خلاف کارروائی میں حکومتی ناکامی اجتماع اور انجمن سازی کے حُقوق پر خود ساختہ پابندی کا سبب بنی۔

اظہار رائے کی آزادی: آئین قانون کی جانب سے اسلام کی شان و شوکت کے تحفظ کی خاطر مناسب حُدود کے نفاذ یا پاکستان کی سالمیت، سیکورٹی یا دفاع، بیرونی ملکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امن عامہ، شائستگی یا اخلاقیات کی پاسداری کو ملحوظ خاطر رکھنے کی شرط پر تحریر و تقریر کی آزادی دیتا ہے۔ قانون ویسے تو شہریوں کو کھلے عام یا نجی محافل میں حکومت پر تنقید کی اجازت دیتا ہے لیکن عدالتی فیصلوں نے آئین کی اس انداز میں تشریح کی جس سے فوج اور عدلیہ پر تنقید ممنوع قرار پائی ہے۔ اس طرح کی تنقید کا نتیجہ قانونی، سیاسی یا مالی سزا کی شکل میں برآمد ہو سکتا ہے۔ توہین مذہب کے قوانین نے فرد کے مذہب اور مذہبی نظریے سے متعلق معاملات کے حوالے سے اظہار رائے کی آزادی کو محدود کر دیا۔ تعزیرات کی رُو سے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کی سزا موت، قرآن پاک میں ترمیم، اس کو نقصان یا توہین کی سزا عمر قید اور دوسرے فریق کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کی سزا دس سال قید ہے۔ عدالتوں کی جانب سے توہین سے متعلق قوانین کا نفاذ کیا گیا، اگرچہ اب تک کسی شخص کو توہین مذہب کا مرتکب ہونے کی بنا پر پھانسی نہیں دی گئی لیکن توہین مذہب کے الزامات نے اکثر لوگوں کی جانب سے ہجوم کو سر عام ملزم کو مارنے اور ایسے لوگوں پر کڑی نظر رکھنے پر اکسایا۔ حکومت نے نفرت آمیز تقریر اور دہشتگردی کے حوالے سے بعض اشارے کنایئے اور زبان استعمال کرنے پر پابندی عائد کی۔

انیتس جولائی کو پشاور ہائی کورٹ کے کمرے میں توہین رسالت کے مقدمہ کی سماعت کے دوران طاہر نسیم کو قتل کر دیا گیا۔ جولائی ۳۱ کو پشاور میں پانچ سے سات ہزار افراد پر مشتمل افراد کی ریلیوں نے طاہر نسیم کے قتل میں ملوث نابالغ فیصل خان کو شاباش دی۔ مظاہرین نے فیصل خان کی فوری رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے حکومت کی جانب سے اس کے خلاف قانونی کارروائی کی مذمت کی۔ خطبات کے دوران عبادت گاہوں میں آنے والوں کو ترغیب دی گئی کے آسیہ بی بی کی رہائی کے بعد اب عدالتوں پر اعتبار نہیں کیا جائے اور ہمیں توہین رسالت کے ملزموں کی قسمت کا فیصلہ خود کرنا چاہیے۔ سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والی ایک تصویر میں پولیس افسران کو ملزم قاتل کے ساتھ "سیلفی" کا پوز بناتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ طاہر نسیم کے خاندان والوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر معذور تھا۔

اخبارات اور میڈیا کی آزادی، بشمول آن لائن ذرائع ابلاغ: حساس معاملات، بشمول سول۔ملٹری تناؤ اور سیکورٹی فورسز کی جانب سے روا رکھی گئی بدسلوکیوں کو رپورٹ کرنے والے صحافیوں کو دھمکیوں، خوف وہراس اور تشدد کا سلسلہ سارا سال بھر چڑھ کر جاری رہا۔ فوج نے ڈائریکٹر جنرل-انٹر سروسز پبلک ریلیشنز اور حکومت نے نگراں ادارے پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی کی توسط سے سینسر شپ لاگو کی۔ قانون کے تحت حکومت ایسی معلومات پر، جو قومی مفاد کے رُو سے تعصب پر مبنی ہوں، پابندی عائد کر سکتی ہے۔ گزشتہ سال کے دوران حکومت نے قومی مفاد سے تصادم کے زمرے میں آنے والی معلومات کی بندش کے لیے اضافی قانونی اختیارات حاصل کیے۔حکام نے اِن قوانین کو میڈیا کو حکومت اور مسلح افواج پر تنقید کرنے سے روکنے یا ایسا کرنے کی پاداش میں سزا دینے کیلئے استعمال کیا۔

پاکستان کے زیرِانتظام کشمیر میں اخبار شائع کرنے کیلئے مالکان کو کشمیر کونسل اور وزارت امور کشمیر سے اجازت حاصل کرنا پڑتی ہے اور صحافیوں کو حکومت اور فوج کی جانب سے فراہم کردہ معلومات پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ بھارتی میڈیا کا مواد نشر کرنے پر پابندیاں تھیں۔ صحافیوں نے بلوچستان میں حقوق کی خلاف ورزیوں اور جبری گمشدگیوں، پشتون تحفظ موومینٹ کے احتجاج اور فوج کی کاروباری سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹنگ پر پابندیوں پر بھی احتجاج کیا۔ جنوری میں وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی اور مواصلات نے سوشل میڈیا پر شہریوں کو آن لائن خطرات سے تحفظ کے قوانین کی منظوری دی۔اکتوبر میں حکومت نے مذکورہ قوانین کو بروئے کار لاتے ہوئے ٹک ٹاک پر وقتی پابندی نافذ کی لیکن بعد میں کمپنی کی جانب سے ممنوعہ مواد اپلوڈ کرنے والے صارفین پر پابندی پر رضامندی کے بعد پابندی ہٹادی۔انسانی حقوق کے نمائندوں کے مطابق حکومت نے مبینہ طور پر مسائل کھڑا کرنے والے انسانی حقوق کارکنوں کے اکاؤنٹ کی معطلی کے لیے ٹوئیٹر سے رابطہ کیا۔

صحافیوں نے اطلاع دی کہ حکومت نے ٹی وی اسٹیشنوں اور دیگر ذرائع ابلاغ پر حزب اختلاف رہنماؤں کے انٹرویوز کی نشریات معطل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔مارچ میں کمیٹی ٹو پروٹیکٹ جرنلسٹس نے اطلاع دی کہ پیمرا نے ملک بھر میں تقسیم کار کمپنیوں سے رابطہ کر کے اُن کو جیو ٹی وی کی نشریات بند یا پھر پچھلے نمبروں پر منتقل کرنے کی ہدایات جاری کیں تاکہ ناظرین کے لیے اُس کی تلاش مشکل ہو جائے۔اس قدم کے بعد جنگ گروپ کے سربراہ اور ایڈیٹر ان چیف کو حراست میں لیا گیا۔

اسلام آباد میں ۲۰۱۸ء میں وزارت داخلہ نے ریڈیو فری یورپ کی پشتو سروس، ریڈیو مشعال، کا اسلام آباد میں واقع دفتر بند کر دیا تھا، وہ تاحال بند ہے۔

تشدد اور خوف وہراس: سیکورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں، جنگجوؤں اور دوسرے گروہوں کی جانب سے ذرائع ابلاغ کے اداروں، صحافیوں اور ان کے اہلخانہ کو دھمکیاں دیں اور انہیں ہراساں کیا گیا۔ خاص طور پر خاتون صحافیوں کو سوشل میڈیا سمیت، جہاں پر انکی موثر موجودگی ہے، دیگر ذرائع سے جنسی تشدد کی دھمکیوں اور ہراساں کئے جانے کا سامنا کرنا پڑا۔ سیکورٹی فورسز کی جانب سے مبینہ طور پر صحافیوں کو اغوا کیا گیا۔ ان میڈیا ہاؤسز کو، جنہوں نے ایسے موضوعات کے حوالے سے خبریں رپورٹ کیں جو حکام کے نزدیک حساس تھے، اکثر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔ مزید برآں دور دراز اور لڑائی سے متاثرہ علاقوں میں فرائض سرانجام دینے والے صحافیوں کے پاس جدید آلات اور اپنے تحفظ کی روایتی مہارتوں کی کمی تھی، جس کی وجہ سے ان پر از خود سینسر کے نفاذ یا کسی خبر کو رپورٹ نہ کرنے کیلئے دباؤ بڑھ گیا۔

مبصرین کے مطابق صحافیوں کو ہراسگی اور دھمکیوں سمیت متعدد نوعیت کے دباؤ کے ہتھکنڈوں کا سامنا تھا۔ سال بھر کے دوران حملہ آوروں نے صحافیوں کو قتل کیا تاہم یہ واضع نہیں تھا کہ اُن کے قتل کا سبب صحافتی کام تھا۔ ۲۳ جولائی کو بلوچستان کے شہر بارکھان میں دو مسلح افراد نے روزنامہ نوید پاکستان سے منسلک سینیئر صحافی انور جان کھیتران کو قتل کیا۔ بروز ۱۷ فروری سندھی ٹی وی چینل کے ٹی این نیوز اور روزنامہ کاوش کے صحافی عزیز میمن کی لاش برآمد ہوئی۔ موت سے قبل عزیز میمن نے پاکستان پیپلز پارٹی اور مقامی پولیس کی جانب سے دھمکیاں ملنے کی اطلاع دی تھی۔ پولیس کے مطابق ۲۶ فروری کو تین سے چار ملزمان کو حراست میں لیا گیا۔ مئی میں جوائنٹ انویسٹیگیشن ٹیم نے حتمی رپورٹ دی کہ عزیز میمن کو منصوبہ بندی کے تحت قتل کیا گیا۔ ۱۶ جون کو نامعلوم افراد نے یوٹیوب چینل چلانے والے آزاد صحافی محمد بلال خان کو خنجر گھونپ کر ہلاک کیا۔

صحافی جبری گمشدگیوں اور گرفتاریوں کا نشانہ بھی بنے۔ ۲۱ جولائی کو فوجی اسٹیبلشمنٹ پر سرعام تنقید کرنے والے مطیع اللہ جان کو اسلام آباد میں ہتھیاروں سے لیس افراد نے اغوا کیا لیکن اُن کو بارہ گھنٹے بعد آزاد کر دیا گیا۔ اغوا کا واقعہ سی سی ٹی وی پر ریکارڈ ہوا جس کی تصویریں سوشل میڈیا پر نشر ہوئیں۔ صحافیوں کے تحفظ کی بین الاقوامی تنظیم کے مطابق مطیع اللہ جان اُن صحافیوں میں شامل تھے جن کو ۲۰۱۸ء میں فوج نے سوشل میڈیا پر ریاست مخالف بیانیہ کی تشہیر کرنے والوں کے طور پر پیش کیا تھا۔ ۴ ستمبر کو سابق صحافی اور پاکستان کی سیکیورٹیز ایکسچینج کمیشن کے جوائنٹ ڈائریکٹر ساجد گوندل نامعلوم افراد کی جانب سے اغوا ہونے کے بعد گم ہوئے اور آٹھ ستمبر کو گوندل نے اپنی محفوظ واپسی کا ٹوئیٹ کیا۔ ۱۲ ستمبر کو پولیس نے ایک اور صحافی اسد علی طور کو ریاست، پاکستانی اداروں اور پاکستان آرمی کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کے الزام میں پاکستان الیکٹرانک کرائمز ایکٹ کے تحت گرفتار کیا۔

کمیٹی فار پروٹیکشن آف دی جرنلسٹس کے مطابق صحافیوں سعید علی اچکزئی اور عبدالمتین اچکزئی نے بلوچستان میں قانون نافذ کرنے والے نیم فوجی ادارے بلوچستان لیویز کے کارندوں پر اُن کو ۱۹ جون کے دن بلاجواز گرفتار کرنے، دو دن حراست میں رکھنے اور مار پیٹ کا الزام عائد کیا۔ اِن صحافیوں نے ۸ جون کو ایک کرونا وائرس سے تحفظ کے قرنطینہ میں ناقص انتظامات کے بارے میں رپورٹ کی تھی۔

سینسر شپ یا مواد کی اشاعت پر پابندیاں: فوج، مذہبی انتہاپسندی اور توہین مذہب کے قانون کے غلط استعمال سے متعلق خبروں کی نشریات کے دوران خود ساختہ سینسر شپ کا مظاہرہ کیا گیا اور صحافیوں کے مطابق اُن پر سال کے دوران طے شدہ بیانیہ کے مطابق رپورٹنگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا گیا اور پیمرا نے میڈیا اداروں کو ایڈیٹوریل پالیسی کے بارے میں ہدایات تک جاری کیں۔

مثال کے طور پر بعض کا کہنا تھا کہ اُن پر فوج کے بیان نشر کرنے اور سرکاری عہدیداروں کے منفی کردار کے بارے میں تردیدی خبریں اخباروں اور خبرناموں میں نشر کرنے کا دباؤ ڈالا گیا۔

صحافیوں کا کہنا تھا کہ انھیں سرکاری طور پر باقاعدگی سے لڑائی والے علاقوں کا دورہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جاتا تھا، یا ان کیلئے ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ایسے علاقوں کی صورتحال کو رپورٹ کرنے کی غرض سے فوجی اہلکاروں کے ہمراہ وہاں جائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان پر ایسی خبریں دینے کیلئے دباؤ ڈالا گیا جو فوجی نکتہ نظر کی تائید کرتی ہوں۔ دیگر خبروں میں عمیق تجزیئے کے بجائے، جسے صحافی حضرات عام طور پر پُر خطر سمجھتے تھے، معروضی رپورٹنگ پر توجہ مرکوز کی گئی۔ مقامی اور غیر ملکی صحافیوں کی جانب سے شکایات موصول ہوئیں کہ انھیں حکومتی اہلکاروں نے ہراساں اور خوفزدہ کیا۔ توہین مذہب اور احمدیوں کے خلاف قوانین کی وجہ سے بعض موضوعات کی اشاعت محدود ہو کر رہ گئی۔ حکومتی اہلکاروں نے غیر ملکی کتابوں کی دوبارہ اشاعت سے قبل ان پر نظر ثانی کی۔۔ درآمد شدہ فلموں، کتب، رسائل اور اخبارات کو قابل اعتراض جنسی اور مذہبی مواد کے شبے میں سینسر کیا گیا۔ فحش ادب، جو ایک ایسا موضوع ہے جو حکومت کی جانب سے وسیع تر معنوں میں مستعمل رہا، ضبط کر لیا گیا۔ ستمبر میں معروف صحافی سہیل وڑائچ کے جنگ میں شائع ہونے والے اخباری کالموں پر مشتمل کتاب کی پچاس ہزار کاپیاں کتابی اسٹالوں سے ضبط کی گئیں۔

حکومت نے مبینہ طور پر ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کرنے اور ممنوعہ مواد دکھانے پر نجی ٹیلیویژن چینلوں پر جرمانہ عائد کیا۔ حکام نے بار بار پیمرا قوانین کو استعمال کرتے ہوئے لائسنس کی معطلی یا ایسا کرنے کی دھمکی دے کر نشریاتی ذرائع ابلاغ کو خاموش کروایا اور ہدف بننے والے چینل کو بنانوٹس کے کیبل پر ایسا نمبر دیا گیا کہ اکثر ٹیلی ویژن پر اُن کی نشریات ڈھونڈنا ہی مشکل تھیں۔ متعدد نشریاتی اداروں کو، خاص طور پر مذہب اور دفاع سے متعلق معاملات کے حوالے سے، اپنے اوپر از خود سینسر شپ نافذ کرنا پڑی۔ سینٹرل بورڈ آف فلم سینسرز نے ایسی غیر ملکی اور مقامی فلموں کو سینسر کیا جن میں جنسی مواد پایا گیا اور بھارتی ہیروز، رہنماؤں اور فوجی شخصیات کا قد کاٹھ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔

حکومت نے نیٹ ورک پر رسائی کے اختیارات کو ذرائع ابلاغ کو زیر اثر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ مسلم لیگ نون کے حمایتی تصور کیے جانے والے میڈیا اداروں کو نشریات میں تعطل کا سامنا کرنا پڑا۔

ملک کے سب سے بڑے نشریاتی ادارے جنگ اور جیو گروپ کی جانب سے بھی ہراساں کئے جانے اور اخبار کی ترسیل میں رکاوٹوں کا سامنا کرنے کی اطلاعات ملیں۔ نامعلوم افراد نے اخبارات کے تقسیم کنندگان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اردو روزنامہ جنگ اور اس ادارے کے انگریزی اخبار دی نیوز کو تقسیم نہ کریں اور جنگ اور جیو گروپ کو اشتہارات دینے پر مشتہرین کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ کیبل آپریٹروں نے جیو ٹی وی کو اپنے کیبل سسٹم سے نکال دیا، یا بار بار اس کیلئے مختص چینل نمبر کو تبدیل کیا۔ پیمرا نے جیو ٹی وی اور نیوز ۲۴ چینل کے لائسنس کے ساتھ مسائل کا بہانہ کرتے ہوئے اُن کی نشریات معطل کر دی۔ حکومت کے ناقد دونوں چینلز نے حکومتی اقدامات کے پیچھے سیاسی چال ہونے کا شبہ ظاہر کیا۔ چینل کو فوری عدالتی احکامات پر بحال کر دیا گیا۔ جنگ اور جیو نیوز کے مالک اور ایڈیٹر ان چیف میر شکیل الرحمان نے ۳۴ سال پرانے ملکیت کے مقدمہ میں ۹ نومبر کے دن ضمانت منظور ہونے تک آٹھ ماہ سلاخوں کے پیچھے گزارے۔ متعدد صحافیوں نے میر شکیل کے خلاف الزامات کو حکومت کی جانب سے دھونس کی کارروائی قرار دیا۔

نشریاتی اداروں کا کہنا تھا کہ حکومت نے سرکاری مفادات کے لیے خطرناک تصور کی جانے والی معلومات کی اشاعت روکنے کے لیے بڑے پیمانہ پر ذرائع ابلاغ کی نگرانی کے اپنے ادارے اور سرکاری اشتہارات کی تقسیم کا نظام استعمال کیا، جو میڈیا اداروں کی آمدنی کا بڑا حصہ ہے۔ کووڈ۔ وباء کے باعث آمدنی میں کمی کی وجہ سے میڈیا اداروں کے نجی شعبہ سے آمدنی کم ہوئی اور اُن کا سرکاری اشتہاروں پر انحصار بڑھ گیا۔ میڈیا اداروں کی سبسکرپشن کی توسط سے آمدنی کا معاملہ سپریم کورٹ میں التوا کا شکار تھا۔ حکومت نے تقسیم کار اداروں پر دردِ سر تصور کیے جانے والے پروگرام نشر کرنے والے چینلوں کو معطل یا نمبر تبدیل کرنے کے لیے دباؤ ڈالا اور نشریاتی اداروں کو اُن کے مواد کی سینسر شپ کرنے پر مالی فوائد پہنچائے۔ ذرائع ابلاغ کے اداروں نے بے باک صحافیوں کو آمدنی یا آپریشن کے لیے خطرہ تصور کرتے ہوئے ملازمتوں سے فارغ کر دیا۔ جولائی میں بلوچی زبان کا واحد ٹی وی چینل "وش" مالی خسارہ کے باعث بند ہو گیا کیونکہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے اس کو اشتہارات اور دیگر متعلقہ آمدنی دینے سے انکار کیا ہوا تھا۔

قوانین برائے ازالہ حیثیت عرفی: ہتک عزت اور توہین مذہب پر فوجداری کارروائی کی جاتی ہے۔ توہین مذہب کی سزا دو سال قید سے لیکر پھانسی تک ہو سکتی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں عوامی نیشنل پارٹی کے چیئرمین نے ایک سیاسی مخالف اور تین اخبارات کے خلاف کردار کشی کا مقدمہ درج کروایا۔ کیس تاحال زیر التوئ ہے۔

قومی سلامتی: بعض صحافیوں نے دعویٰ کیا کہ حکام نے حکومتی پالیسیوں یا فوجی اور سرکاری افسروں پر تنقید والا مواد سینسر کرنے یا اس کی تقسیم پر پابندی عائد کرنے لیے قومی سلامتی کے تحفظ کے قوانین کا حوالہ دیا۔ الیکٹرانک میڈیا پروگرامز و اشتہارات ضابطہ اخلاق میں شامل ایک شق کے تحت کسی بھی ایسے علاقے میں، جہاں فوجی کارروائی ہو رہی تھی، رپورٹنگ پر پابندی عائد کی گئی۔

غیر سرکاری اثرات: غیر ریاستی عناصر کی جانب سے صحافتی کارکنوں پر تشدد میں کمی آئی لیکن جنگجو اور جرائم پیشہ عناصر کی جانب سے صحافیوں اور ان کے خاندانوں کو جان سے مارنے، انھیں اغوا کرنے، ان پر حملے کرنے اور انہیں خوفزدہ کرنے کی وجہ سے، خاص طور پر خیبر پختونخوا کے قبائلی علاقوں اور بلوچستان میں، صحافیوں کو خود ساختہ سینسر شپ پر عمل پیرا ہونا پڑا۔

انٹرنیٹ کی آزادی

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) مواصلات کے قیام، چلانے اور اس کی دیکھ بھال کی ذمہ دار ہے اور ٹیلی مواصلات کے ذرائع پر تمام مواد کی نشریات اور مواصلاتی رابطہ ذرائع پر مکمل کنٹرول رکھتی ہے۔

حکومت نے اسلام مخالف، فحش، ریاست اور عسکری اداروں پر تنقید تصور کئے جانے والے مواد کی روک تھام یا اُس کی بندش کے لیے قومی سطح پر مواد کی نگرانی اور چھان بین کا باضابطہ نظام استعمال کرتی ہے۔ برقی نشریاتی ذرائع پر جرائم کی روک تھام کا قانون مجریہ ۲۰۱۶ء حکومت کو انٹرنیٹ پر مواد ہٹانے کے وسیع اختیارات دیتا ہے جسے حکام نے سول سوسائٹی کے پر کاٹنے کیلئے استعمال کیا۔

حکومت نے متعدد ویب سائٹس کو مبینہ طور پر غیر اسلامی، فحش، توہین آمیز اور انتہا پسند مواد کی تشہیر کے الزام میں بند کر دیا۔ پی ٹی اے کی ویب سائیٹ تجزیاتی ڈویژن ٹیم توہین آمیز یا جذبات مجروح کرنے والے مواد کی نظرثانی اور رپورٹ کرنے کی حتمی طور ذمہ دار ہے جبکہ ایف آئی اے ممکنہ قانونی کارروائی کرتی ہے۔ پی ٹی اے دیگر متعلقہ وزارتوں سے بھی نفاذ قانون کے اُمور پر روابط قائم رکھتی ہے۔ ایسی اطلاعات بھی موجود تھیں کہ حکومت نے بلوچوں کی آزادی کی پرچار کرنے والی ویب سائٹس کو بلاک یا کنٹرول کرنے کی کوشش کی اور حکومت کی جانب سے نگرانی کا سافٹ ویئر استعمال کرنے کی بھی اطلاعات تھیں۔ مواد کی نگرانی کے عمل میں شفافیت

اور احتساب کا فقدان تھااور حکومت نے متعدد بار کارروائی کے لئے قانونی طریقہ کار کو نظرانداز کرتے ہوئے غیر واضح پیمانہ استعمال کیا۔

حُکام، خاص طور پر فوج، نے مخالف آواز اور عسکری قوتوں پر تنقید خاموش کرانے کے لیے آن لائن آزادی پر بندش کی کوشش کی۔ فریڈم ہاؤس کی فریڈم آف دی نیٹ رپورٹ ۲۰۲۰ء کے مطابق حُکام نے احتجاجی مظاہروں، انتخابات، مذہبی اور قومی تہواروں کے موقع پر مواصلاتی نظام کو امن وامان کا جواز دے کر معطل کر دیا۔

نومبر میں حکومت نے غیر قانونی مواد ہٹانے اور بندش کے قوانین ۲۰۲۰ء شائع کیے، جس کو باضابطہ طور پر آن لائن خطرات سے شہریوں کا تحفظ قوانین کا نام دیا گیا اور حکام کو فراہم کردہ پیمانے اور اختیارات کو مرتب کرتا ہے جن کے تحت وہ حکومت کی جانب سے نشاندہی کردہ اُس مواد کو ہٹائیں یا اُس پر پابندی نافذ کریں جو دینِ اسلام کی شان، پاکستان کی سالمیت، سلامتی اور دفاع سے متصادم، امن و عامہ اور تہذیب اور اخلاقیات کے اقدار سے متصادم ہو۔ شعبہ کے مبصرین نے اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ پیمانے غیر واضح، متزلزل اور اکثر پی ٹی اے اور اُس کی خدمات کی جانب سے صوابدیدی طور استعمال کیے گئے، خاص طور پر جس مواد کو وہ حکومت کے خلاف تنقید تصور کرتے ہیں۔ مبصرین کے مطابق کردار کشی کو ثابت کرنا، مثال طور، مکمل طور قانونی پیمانوں میں وضع کردہ تھا لیکن حکومت نے اکثر اپنے اور اعلیٰ حکام پر تنقید والا مواد ہٹانے کا مطالبہ اپنی ماورائے عدالت مفروضوں پر کیا۔

نئے ضوابط کے تحت سوشل میڈیا اور دیگر انٹرنیٹ کمپنیاں حکام کی جانب سے غیر قانونی قرار دیے جانے والے مواد کی نگرانی، ہٹانے یا بلاک کرنے کی مجاز ہوں گی۔

مذکورہ ضوابط کمپنیوں کو چوبیس گھنٹے کے اندر عملدرآمد یقینی بنانے کا پابند کرتے ہیں یا پھر پی ٹی اے کی جانب سے وسیع تر وضع کردہ پیمانہ کے تحت ہنگامی صورتحال میں چھ گھنٹے کے اندر مواد ہٹانا پڑے گا۔ مزید برآں ضوابط سوشل میڈیا کمپنیوں کو بعض نوعیت کے مواد کی لائیو نشریات یا اپلوڈ کرنے پر بندش کے انتظامات کا تقاضا کرتے ہیں اور اُن کو صارفین کے لیے ہدایات واضح انداز میں شائع کرنے کا

پابند کرتے ہیں، جس میں مذہبی، ثقافتی یا سیاسی طور حساس نوعیت کے مواد کو اپلوڈ کرنے سے منع کرنا شامل ہے۔ مذکورہ ضوابط مبہم ہونے کی وجہ سے کمپنیاں جزوی یا مکمل پابندیوں سمیت سزا کے ڈر سے اپنے پلیٹ فارم سے مواد ہٹانے کی پاسداری کر سکتی ہیں۔ نئے ضوابط سوشل میڈیا کمپنیوں کو وہ معلومات بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فراہم کرنے کا پابند بناتے ہیں جو انکرپٹیڈ صورت میں موجود ہو۔ ٹیکنالوجی کمپنیوں نے پاکستان میں دفتر قائم کرنے سے انکار اس خوف سے کیا کہ اُن کے ملازمین کو ممکنہ مواد نگرانی تنازعات میں بطور سودے بازی کا ذریعہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

قانون کے مطابق سوشل میڈیا کمپنی کسی بھی مشکوک صارف کی معلومات حکام کو فراہم کرنے کی پابند ہو گی۔ کئی سوشل میڈیا صارفین نے نئے قانون پر تنقید کرتے ہوئے اس کو آمرانہ نوعیت کا قرار دیا۔

پی ٹی اے نے بھی سوشل میڈیا اور وڈیو اسٹریم کرنے والی ایپلیکیشنز جیسا کہ یوٹیوب، ٹوئیٹر اور ٹک ٹاک پر کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پی ٹی اے نے یوٹیوب سے پاکستان میں ناظرین کے لیے فحش، غیر اخلاقی، برہنہ اور نفرت انگیز مواد فوری طور ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اگرچہ پی ٹی اے نے دعویٰ کیا کہ اس کا ارادہ عریانی اور غیر اخلاقی مواد کی تشہیر روکنا ہے تاہم صارفین نے الزام لگایا کہ وہ حکومت، خاص طور فوج، کے ناقدین کو نشانہ بنا رہی تھی۔ انٹرنیٹ سہولیات فراہم کرنے والوں کا بھی کہنا تھا کہ پی ٹی اے غیر اخلاقی مواد کا جواز بنا کر سیاسی اختلاف کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ آن لائن صارفین نے سینسر شپ میں اضافہ کی شکایت کی۔

اکتوبر میں پی ٹی اے نے چین میں قائم وڈیو اسٹریم ایپ ٹک ٹاک پر پابندی لگائی کہ وہ بعض شہریوں کی جانب سے فحش اور غیر اخلاقی قرار دیا جانے والے مواد کی نگرانی اور اُس پر قابو پانے میں ناکام ہو گیا ہے۔ پی ٹی اے نے ٹک ٹاک کی جانب سے عوامی اور سرکاری شکایتوں پر مواد کو فوری ہٹانے پر رضامندی کے بعد اُس کو بحال کر دیا۔

ستمبر میں پی ٹی اے نے ٹنڈر، ٹیگڈ، اسکاؤٹ، گرنڈر اور سے ہائے سمیت پانچ میل جول اور لائیو اسٹریم ایپلیکیشنز کو بلاک کر دیا کہ وہ غیر اخلاقی اور فحش مواد اپلوڈ نشر کر رہے ہیں۔ قانون ہم جنس پرستی اور غیر ازدواجی تعلقات قائم کرنے سے ممانعت کرتا ہے۔ پی ٹی اے نے تبصرہ کیا کہ پانچوں کمپنیاں اُس کی مقرر کردہ مدت میں جواب دینے میں ناکام رہیں، تاہم یہ نہیں بتایا کہ وہ مدت کتنی تھی۔ ان

میل جول کی ویب سائیٹوں کے ساتھ مسلسل مذاکرات کے باوجود پابندی برقرار رہی کیونکہ حکام کے مطابق اِن ویب سائیٹوں پر صرف غیر قانونی سرگرمیاں ہی منعقد ہو رہی ہیں۔

اگست اور پھر ستمبر میں ڈیڑھ سو صحافی خواتین اور اُن کے متعدد مرد ہم منصب افراد نے دو پٹیشنز پر دستخط کر کے حکومت، سیاسی پارٹیوں اور اُن کے سوشل میڈیا کارندوں کی جانب سے "گھناؤنے اور متشدد" کے خلاف آگہی مہم منعقد کی۔ پٹیشن میں حکومت اور تمام تر سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی جانب سے صحافیوں پر جھوٹی خبریں دینے کے الزامات پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ صحافیوں نے کہا کہ اُن پر اکثر سیاسی ایجنڈے اور حزب اختلاف کے تنخواہ دار ہونے کے الزامات بھی عائد کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے خاص طور حکومت پر تنقید کے ردعمل میں ہراسگی کا سامنا کرنے کا ذکر کیا۔

اُن کی پٹیشنز میں صحافیوں نے الزام عائد کیا کہ آن لائن ہراسگی اور غنڈہ گردی مہم جوئیوں نے اُن کے لیے پیشہ ورانہ ذمہ داریاں نبھانا مشکل بنا دیا ہے۔ خواتین صحافیوں نے شکایت کی کہ آن لائن ہراسگی کا آغاز اکثر سرکاری حکام کرتے ہیں جبکہ بعد میں حکومتی جماعت سے منسلک ٹوئیٹر اکاؤنٹ اُن عہدیداروں کے ہم آواز بنتے ہیں۔ صحافیوں نے مزید الزام لگایا کہ اُن کو ہراساں، بدنام اور دھمکی دینے کی منظم مہم چلائی جاتی ہے۔ وہ مرد صحافی جن کی رپورٹوں میں حکومت کی کارکردگی اور ریاستی اُمور میں سیکیورٹی اداروں کی بڑھتی ہوئی مداخلت، بدعنوانی یا احتساب کے حوالہ سے سوالات اُٹھائے گئے اُن کو بھی مبینہ طور پر سیاسی پارٹیوں یا طاقتور سرکاری اداروں، بشمول فوج کی جانب سے فعال اشتعال پھیلانے والے اکاؤنٹس سے آن لائن دھمکیوں، منظم کردار کشی مہم کا سامنا کرنا پڑا۔ صحافیوں کو مذکورہ الزامات کے ساتھ ساتھ اکثر "پاکستان مخالف" اور تنخواہ دار ایجنٹ کے الزامات سے بھی نوازا گیا۔ ستمبر میں تین صحافیوں، بشمول سابق پیمرا چیئرمین ابصار عالم، کو وزیر اعظم اور عسکری اداروں کے خلاف مبنہ طور پر سوشل میڈیا پر ہتک آمیز زبان استعمال کرنے پر بغاوت کی فرد جرم لاگو کی گئی۔

سابقہ فاٹا اور بلوچستان کے دیہی علاقوں میں طویل مدت کے لیے مواصلاتی نظام معطل کیا گیا، جہاں پر بعض اضلاع میں ۲۰۱۷ء سے لیکر انٹرنیٹ یا موبائل رابطہ کی سہولیات منقطع ہیں۔ دیگر لوگوں کے مطابق بعض علاقوں میں فوج کے زیر انتظام فعال سپیشل کمیونیکیشن آرگنائیزیشن (ایس سی او) کی جانب سے فراہم کردہ انٹرنیٹ کا معیار خراب اور رفتار سست ہونے اور بنیادی ڈھانچے کی عدم دستیابی کی وجہ سے رابطہ میں مشکلات درپیش آتی ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے مطابق سابقہ فاٹا کے بعض رہائشیوں نے کووڈ۔۱۹ وبا کی سنجیدہ صورتحال کو نہیں سمجھا کیونکہ انٹرنیٹ کی بندش نے خبروں کی ترسیل کو روک دیا تھا جبکہ صحافیوں نے دعویٰ کیا کہ بعض رہائشیوں نے تو مارچ کے وسط تک کروناوائرس کے بارے میں سنا تک نہیں تھا۔

اپریل ۱۴ کو اسلام آباد ہائی کورٹ نے پی ٹی اے کو سابقہ فاٹا میں تھری جی اور فور جی انٹرنیٹ سروس فوری طور بحال کرنے کا حکم دیا۔ فیصلہ طالبعلموں کی جانب سے آن لائن تعلیم محروم ہونے کی وجہ سے کیے جانے والے احتجاج کے بعد کیا گیا۔ صارفین نے شکایت کی کہ عدالتی احکامات کے باوجود ایس سی او کی اجارہ داری ہے اور وہ علاقوں میں بہتر انٹرنیٹ سہولیات فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔

بروز ۲۴ اپریل وزیراعظم عمران خان نے اعلان کیا کہ انٹر سروسز انٹیلیجنس کی جانب سے دہشت گردوں کی نگرانی کے لیے استعمال کیا جانے والا "ٹریک اینڈ ٹریس سسٹم" اب کروناوبا کے پھیلاؤ کی نگرانی کے لیے بھی بروئے کار لایا جائے گا، جس کے بارے میں انسانی حقوق کے کارکنوں نے تحفظات کا اظہار کیا کہ ایسی کھلی چھوٹ دینے سے یہ جاسوسی نظام اختلاف رائے کے حامل افراد کی جانچ پڑتال کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ تاہم کچھ طبّی ماہرین نے وبا کا پھیلاؤ جاننے کے لیے اس نظام کی صلاحیت پر اعتماد کا اظہار کیا۔

آٹھ جون کو پی ٹی اے نے عوامی اعلان جاری کرتے ہوئے لوگوں سے اپنا ورچوئل پرائیویٹ نیٹ ورک (وی پی این) اتھارٹی کے ساتھ رجسٹر کرنے کی ہدایت کی۔ سول سوسائٹی کے کارکنوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اس نوعیت کی رجسٹریشن سے حکام کی نگرانی کی صلاحیت میں اضافہ اور صارفین کی رازداری محدود ہو جائے گی۔

تعلیم وتدریس کی آزادی اور ثقافتی تقریبات

حکومت تعلیمی آزادی کے اُمور میں مداخلت کرتے ہوئے غیر ریاستی سرگرمیوں کی روک تھام کی آڑ میں ثقافتی تہواروں کی بندش، نگرانی اور سینسر شپ کے اقدامات پر عمل پیرا رہی۔ فنون لطیفہ کی نمائشوں، موسیقی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حکومت کی مداخلت جاری رہی۔ اس قسم کی تقریب منعقد کرنے کیلئے درکار سرکاری اجازت نامہ دینے سے اکثر حکام نے ٹال مٹول کی۔

ب) پُرامن اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی

آئین اور قانون پُرامن اجتماع اور انجمن سازی کا حق فراہم کرتے ہیں تاہم یہ آزادیاں مشروط ہیں۔

پُرامن اجتماع کی آزادی

اگرچہ سابقہ فاٹا بھی باقی ملک میں نافذ قانونی ڈھانچہ کے زیر انتظام ہے تاہم سویلین اور عسکری حُکام نے مغربی پاکستان نفاذ امن عامہ قانون اور تعزیراتی پینل کی شق ۱۴۴ کے تحت اجتماعی سزا دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ قوانین حکام کو نئے ضم ہونے والے علاقوں میں اجتماع اور تقریر کے حقوق معطل کرنے کے دیرینہ رواج برقرار رکھنے کا اختیار دیتے ہیں۔ قانون کے تحت ضلعی انتظامیہ پولیس کی اجازت کے بغیر چار سے زائد افراد کے اجتماع کو روک سکتی ہے۔ قانون کی رُو سے حکومت کو سیکورٹی وجوہات کی بنیاد پر جنازے کے جلوس کے سوا تمام ریلیوں اور جلوسوں پابندی لگانے کی اجازت ہے۔

حکام نے بالعموم احمدیوں کو کانفرنسوں اور اجتماعات کے انعقاد سے روکا۔ احمدیوں نے گزشتہ سال احمدی- مخالف بلووں کے دوران تباہ شدہ عبادتگاہیں کھولنے کی حکام کی جانب سے اجازت نہ دینے کو اپنے خلاف امتیازی سلوک کے بطور ثبوت پیش کیا۔

سال کے دوران پی ٹی ایم نے انصاف کے مطالبے اور حکومت کے سکیورٹی اداروں کی زیادتیوں سے تحفظ کے لئے دھرنوں اور مظاہروں کے لئے اپنے حامیوں کو جمع کیا جن میں بیشتر پشتون تھے۔ ۲۰۱۹ء میں حکومت کی جانب سے پی ٹی ایم کے خلاف سخت رویہ

اپنانے کے عزم کے بعد ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں اور جلوسوں کی تعداد میں کمی دیکھنے میں آئی۔ تحریک کے کئی اہم رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد زیادہ سختی ہوئی تاہم پی ٹی ایم کے کارکن پھر بھی فعال رہے۔

دس فروری کو لورالائی بلوچستان میں پولیس نے ۱۳ پی ٹی ایم کارکنوں کے خلاف نفرت انگیز خطاب کا مقدمہ درج کیا۔ پولیس کا موقف تھا کہ پی ٹی ایم کارکنوں نے اپنے ساتھی ارمان لونی کی برسی کے جلوس میں سیکیورٹی اداروں کے خلاف نعرے بازی کی۔

۲۶ جنوری کو پولیس نے پی ٹی ایم سربراہ منظور پشتین کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا تاہم ۲۶ فروری کو رہا کر دیا گیا۔

۲۵ فروری کو جمیعت علمائے اسلام فضل (جی یو آئی ایف) سکھر نے سکھر میں آٹھ مارچ کو منعقد ہونے والے عورت آزادی مارچ میں خلل ڈالنے کے ارادوں کا اعلان کیا۔ جی یو آئی کے مطابق عورت مارچ فحاشی کو فروغ دیتا ہے اور اسلامی اقدار، آئین اور مقامی ثقافت سے متصادم ہے۔ سندھ پولیس نے مولانا عبدالمجید ہزاروی سمیت حملہ آوروں کو گرفتار کیا۔ حکام کے مطابق گرفتار ہونے والے فرد نے تشدد بھڑکایا جس کی وجہ سے مارچ کے شرکاء پر پتھراؤ بھی کیا گیا۔ متعدد سیاستدانوں، بشمول مرکزی دھارے کی جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں، نے عورت مارچ کو اسلام اور روایات مخالف قرار دے کر اُس کی مخالفت کی۔ کراچی میں مارچ کے شرکاء نے برابر مواقع، خواتین، خواجہ سراء اور ہیجڑوں کے خلاف تشدد کے خاتمہ کا مطالبہ کیا۔ سکھر میں ہونے والے مارچ کے شرکاء نے غیرت کے نام پر قتل اور قبائلی جرگہ نظام کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔

جولائی ۳۰ اور ۳۱ کو مظاہرین اور سیکیورٹی فورسز کے درمیان جھڑپوں میں چار افراد قتل اور ۲۸ زخمی ہوئے۔ مظاہرین حکومت سے کرونا وبا کی وجہ سے بند کی جانے والی افغان سرحد راہداری چمن کے مقام پر کھولنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ راہداری بلوچستان میں تجارت، معاشی سرگرمیوں اور دیہاڑی پر کام کرنے والے مزدوروں کے گزرنے کے لیے کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔

ذرائع ابلاغ کے مطابق جنوبی لاہور میں دوران احتجاج پولیس کی جانب سے آنسو گیس اور پانی کے کینن استعمال کرنے کی وجہ سے زخمی ہونے والا ایک پنجابی کسان پانچ نومبر کو اسپتال میں چل بسا۔ میڈیا کے مطابق گندم کی کاشت سے قبل گندم کی قیمتوں پر ضابطہ میں

حکومتی ناکامی کے خلاف ہونے والے احتجاجی سلسلوں کی کڑی میں سے ایک تین نومبر کو ایسے ہی احتجاج میں ۰۰ الوگ شریک تھے کہ پولیس نے ٹریفک کھولنے کے لیے کارروائی کی۔

انجمن سازی کی آزادی

آئین انجمن سازی کی مشروط آزادی قانون کے تحت عائد بعض پابندیوں کے ساتھ فراہم کرتا ہے۔ حکومت بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کی خود مختاری سلب کرنے اور مقامی این جی اوز کی فلاحی سرگرمیوں اور آبادیوں تک رسائی مشکل بنانے والی پالیسیوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ آئی این جی اوز، اقوام متحدہ کے اداروں اور غیر ملکی سفارتخانوں کو اندرون ملک سفر، بعض منصوبہ جاتی سرگرمیوں یا نئے منصوبوں کے آغاز سے پہلے این او سی کی صورت میں حکومت کی اجازت طلب کرنی پڑتی ہے۔ حکومت کے توسط سے منصوبوں کا اطلاق کرنے والے بعض اقوام متحدہ اداروں کو این او سی لینے کی ضرورت نہیں پڑتی تاہم یہ ادارے مقامی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ اشتراک کار کریں تو اُن پر این او سی کا حُصول لازمی بن جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے بعض اداروں نے خیبر پختونخوا حکومت کے کچھ اداروں کے ساتھ یادداشت ناموں پر دستخط کر کے این او سی کے شرط سے جان چھڑائی۔

این او سی منظوری میں حکومتی سست روی، مالی عدم استحکام اور فعالیت کی غیر یقینی آئی این جی اوز کی سرگرمیوں میں باعث رکاوٹ بنیں۔ این او سی کے حُصول کی سخت شرائط، سیکیورٹی اداروں کی جانب سے معلومات کی فراہمی کی کثرت سے اور صوابدیدی مطالبوں اور متواتر ہراسگی کی وجہ سے منصوبوں پر کام متاثر ہوا، خاص طور پر اُن علاقوں میں جو امداد سے کافی مستفید ہو سکتے تھے، جیسا کہ نئے انضمام شدہ اضلاع۔

آئی این جی اوز کو فنڈز کے حصول، بینک اکاؤنٹس کھولنے اور ایف بی آر سے ٹیکس استثنیٰ حاصل کرنے میں اضافی رکاوٹوں اور بین الاقوامی عملہ اور معاونین کے لیے ویزا کے حصول میں مشکلات کا سامنا رہا۔ ۲۰۱۵ء میں اختیار کیے جانے والا آن لائن رجسٹریشن نظام نے رجسٹریشن کے حصول کو مزید مشکل، کم شفاف اور متعدد بین الاقوامی این جی اوز کے لیے پیچیدہ بنا دیا۔ رجسٹریشن کا عمل وسیع

دستاویزات، بشمول مالی امور کی تفصیلات، سالانہ بجٹ اور ڈونر کی مدد کی تفصیل پر مبنی خط کی دستیابی کی طلب کرتا ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد شرائط ہوتی ہیں۔ تنظیموں کو رجسٹریشن کے دوران اور بعد میں سیکیورٹی اداروں اور دیگر سرکاری محکموں کی جانب سے مسلسل تفتیش اور ہراسگی کا سامنا تھا۔ تنظیموں کو بعض ایسے موضوعات پر توجہ کی وجہ سے بھی نشانہ بنایا گیا جن کو حکومت حساس سمجھتی ہے جیسا کہ جمہوریت کا فروغ، پریس کی آزادی، مذہبی آزادی اور انسانی حُقوق۔

۲۰۱۸ء میں وزارتِ داخلہ کی جانب سے رجسٹریشن منسوخ ہونے والی ۲۰ آئی این جی اوز ۲۰۱۹ء میں ابتدائی منسوخی کے خلاف اپیل کرنے کے لیے انٹر ایجنسی کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں۔ دوران سماعت آئی این جی اوز کو رجسٹریشن کی منسوخی کا اصل سبب نہیں بتایا گیا اور نہ ہی اُن کو اپنی قانونی حیثیت کی بحالی کے لیے مطلوبہ اقدامات کرنے کی واضح ہدایات فراہم کی گئیں۔ فروری میں وزارت داخلہ نے ماضی میں رجسٹریشن سے انکار کی جانے والی آٹھ این جی اوز سمیت نو بین الاقوامی ترقیاتی تنظیموں کو دوبارہ درخواست دینے کی دعوت دی۔ ستمبر تک موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق وزارت نے اپیلوں پر فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ تصدیق شدہ رجسٹریشن کے بغیر بعض صوبوں میں این او سی کا حصول مشکل بن گیا، جس کی وجہ سے منصوبوں پر عملدرآمد اور ان کی نگرانی میں رکاوٹ پیش آئی حتیٰ کہ ان بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کو بھی رکاوٹ کا سامنا رہا جنہوں نے رجسٹریشن کے نئے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

توثیق شدہ اندراج کے بغیر آئی این جی اوز کے لیے طویل المیعاد حکمت عملی وضع کرنے یا منصوبہ سازی اور بین الاقوامی اداروں، حکومتوں اور دیگر مخیر اداروں سے فنڈز کی حُصولی میں مشکلات درپیش تھیں۔ رجسٹریشن کے عمل میں عدم شفافیت اور غیر یقینی کی صورتحال کی وجہ سے بعض بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کو مجبوراً اپنے اندراج کی درخواست واپس لینا پڑی اور ملک میں اپنا کام بند کرنا پڑا۔ دریں اثناء بعض دوسری صورتوں میں جن این جی اوز نے رجسٹریشن حاصل کر لی تھی ان کو تاحال عملہ کی کمی اور منصوبہ جاتی سرگرمیوں اور مقامی تنظیموں کے ساتھ معاہدوں کی تکمیل میں سرکاری مداخلت کا مسئلہ درپیش تھا۔

حکومت نے وفاقی اور صوبائی دونوں سطحوں پر غیر ملکی فنڈز سے چلنے والی مقامی غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی رسائی بھی ایک علیحدہ رجسٹریشن نظام، اعتراض نہ ہونے کی سند کے حصول اور دیگر شرائط کے ذریعے محدود کی۔ حکام نے مقامی این جی اوز کے لئے یہ شرط عائد رکھی کہ وہ غیر ملکی رقوم کے حصول، کسی جگہ کی بکنگ، یا تقریبات کے انعقاد کے لئے یونیورسٹی کی جگہوں کے استعمال یا "حساس" انسانی حقوق پر کام کرنے سے قبل این او سی حاصل کریں۔ حتیٰ کہ جب غیر ملکی فنڈز حاصل کرنے والی مقامی این جی اوز کا مناسب طور پر اندراج کر لیا گیا، تب بھی حکومت نے اکثر ان کی این او سی کے حصول کی درخواستوں کو مسترد کر دیا اور اُن کی متواتر نگرانی کی گئی اور ہراساں کیا گیا۔ وزارت داخلہ اور وزارت خزانہ کی اقتصادی امور ڈویژن نے، جو مقامی این جی اوز کی نگراں ہے، مارچ میں کووڈ۔۱۹ ریلیف سرگرمیوں پر کام کرنے والی مقامی اور بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے لیے شرائط میں نرمی کا اعلان کیا۔

سلامتی اور مالی اُمور سے منسلک وفاقی اداروں کی ہدایت پر سندھ حکومت نے غیر سرکاری تنظیموں کی رجسٹریشن کی بحالی کے لیے نئے اقدامات متعارف کراوئے۔ اگست میں این جی اوز کے ایک گروپ نے سندھ چیئرٹیز رجسٹریشن اینڈ ریگیولیشن ایکٹ مجریہ ۲۰۱۹ء کو سندھ ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ پٹیشن کے مطابق حکومت نے آئین میں دی گئی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے انجمن سازی کے حق کی آزادی کو سلب کیا ہے۔ مزید دلیل دی گئی کہ متعارف کیے جانے والے ضوابط کا مقصد این جی اوز کو سدھارنا نہیں بلکہ ان کو نااہل اور ناکارہ بنانا ہے۔ این جی اوز کے نمائندوں نے اطلاع دی کہ سیکیورٹی اداروں کی جانب سے ہراسگی اور سرکاری پابندیوں میں اضافہ کی وجہ سے اہم این جی اوز نے ملازمین اور سرگرمیوں میں کمی کی ہے۔

ج) مذہبی آزادی

محکمہ خارجہ نے قانون برائے مذہبی آزادی مجریہ ۱۹۹۸ء، ترمیم شدہ، کے تحت پاکستان کو ۲۰۱۸، ۲۰۱۹، ۲۰۲۰ میں باعث تشویش ملک قرار دیا کہ وہاں کی ریاست مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں میں ملوث یا اُن کو برداشت کرتی ہے۔ محکمہ خارجہ کی بین الاقوامی مذہبی آزادی رپورٹ مندرجہ لنک پر ملاحظہ کریں

www.state.gov/religiousfreedomreport/

د) نقل وحرکت کی آزادی

قانون اندرون ملک نقل وحرکت اور بلاروک ٹوک غیر ملکی سفر، ترک وطن اور وطن واپسی کی اجازت دیتا ہے، لیکن حکومت نے ان حقوق کو محدود کیا۔ ۲۰ جنوری کو ہزارہ بلوچ وکیل اور انسانی حُقوق کی کارکن جلیلہ حیدر کو ایف آئی اے نے لاہور ایئرپورٹ پر حراست میں لیکر برطانیہ میں حقوق نسواں کے موضوع پر ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے سفر سے روک دیا۔ حیدر کے مطابق مبینہ "ریاست مخالف سرگرمیوں" میں ملوث ہونے کے جواز پر اُن کے بیرون ملک سفر پر پابندی عائد تھی۔

اندرون ملک نقل وحرکت: سابقہ فاٹا اور بلوچستان کے بعض علاقوں تک رسائی پر حکومتی پابندیوں سے، جو حفاظتی خدشات کے پیش نظر تھیں، نقل وحرکت کی آزادی متاثر ہوئی۔ حکومت نے ملک کے ان علاقوں کو جنہیں "حساس" قرار دیا گیا تھا، سفر کے لئے عدم اعتراض کے سرٹیفکٹ کی منظوری کی شرط عائد رکھی۔

بیرون ملک سفر: قانون کے تحت اسرائیل کے سفر کی ممانعت ہے اور ملک کے پاسپورٹ پر یہ درج ہوتا ہے کہ "یہ اسرائیل کے سوا "تمام ملکوں کے سفر کے لیے موثر ہے۔

پاسپورٹ کے اجراء کی درخواستوں میں درخواست گزاروں کے لئے اپنی مذہبی وابستگی کا اندراج کروانا لازمی تھا اور خود کو بطور مسلمان شامل کروانے کے خواہشمند افراد پر یہ حلف لینا لازمی تھا کہ ان کا حضرت محمدؐ کے خاتم النبین ہونے پر کامل ایمان ہے اور احمدیہ تحریک کا بانی ایک جھوٹا نبی ہے۔ احمدی نمائندوں نے رپورٹ کیا کہ حکام نے حلف نامہ پر دستخط نہ کرنے پر اُن کے پاسپورٹ پر لفظ "احمدی" تحریر کیا۔

پالیسی کے مطابق سرکاری ملازمین اور طالب علموں کے لئے بیرون ملک سفر کے لئے حکومت سے این او سی لازمی حاصل کرنا ہوتا ہے، تاہم حکام طالبعلموں کے لیے مذکورہ شرط پر شاذونادر ہی عمل کرتے ہیں۔

حکومت نے ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل افراد کو ملک سے روانہ ہونے سے روکا۔ اس فہرست کا بیان کردہ مقصد "ریاست کے خلاف سرگرمیوں، دہشت گردی یا کالعدم تنظیموں سے متعلق سرگرمیوں میں ملوث افراد اور اعلیٰ عدالتوں کے احکامات پر اس فہرست میں شامل کئے گئے افراد کو ملک چھوڑنے سے روکنا ہے لیکن سول سوسائٹی کے مطابق حکام نے انسانی حقوق کے دفاع کے کارکنوں اور حکومت اور فوج کے ناقدین کے نام بھی ای سی ایل میں شامل کیے۔ اس فہرست میں شامل افراد کو اپنے نام فہرست سے ختم کرانے کے لئے عدالتوں میں اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔

جلاوطنی: حکومت نے دیگر ملکوں سے ملک بدر کئے گئے بعض پاکستانیوں کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ حکومت نے بیرون ملک قائم پاکستانی سفارتخانوں کی جانب سے جاری کردہ پاسپورٹس کو جعلی قرار دیتے ہوئے وہاں سے ملک بدر کئے گئے افراد کو غیر شناخت شدہ پاکستانی شہری کہتے ہوئے داخلہ کی اجازت نہیں دی۔

ز) اندرون ملک دربدر اور بے وطن افراد: خیبر پختونخوا اور سابقہ فاٹا میں عسکری سرگرمی اور فوجی کارروائی کے نتیجے میں ۲۰۰۸ء سے بڑے پیمانے پر آبادیاں بے گھر ہوئی ہیں۔ ان بے گھر افراد کی واپسی سیکیورٹی کے بہتر حالات میں جاری ہے۔ حکومت اور اقوام متحدہ کے اداروں جیسا کہ اقوام متحدہ کے کمشنر برائے پناہ گزین افراد (یو این ایچ سی آر)، حکومت اور یو این ایچ سی آر، یونیسیف اور عالمی ادارہ خوراک جیسے اقوام متحدہ کے اداروں نے تنازع سے متاثر ہونے والے افراد کی، جو عمومی طور پر میزبان خاندانوں، کرائے کے مکانوں یا

نسبتاً کم تعداد میں خیموں میں مقیم تھے، معاونت وتحفظ کے لئے اشتراک کیا۔ بے گھر ہونے والی کئی آبادیوں کو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں کے باہر غیر رسمی رہائشی آبادیوں میں ٹھہرایا گیا۔

حکومت نے فوجی کارروائیوں کی وجہ سے بے گھر ہونے والے شہریوں کی معاونت کرنے والے انسانی ہمدردی کی بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں پر سابق فاٹا کے تمام اضلاع تک رسائی کے لئے عدم اعتراض کی سند (این او سی) کے حصول کی درخواست کی شرط نافذ کی۔ ان اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کے مطابق سرٹیفکیٹ کے حصول کا طریقہ بہت پیچیدہ تھا اور منصوبوں کو بہت زیادہ تاخیر کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت نے انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے اداروں کی جانب سے رسائی اور سلامتی سے متعلق خدشات کے اظہار کے باوجود سابق فاٹا کے ان اضلاع میں، جہاں فوجی کارروائیاں کی گئی تھیں، اور ان کے قریب آئی ڈی پی کیمپ قائم کئے۔ فلاحی کارکنوں کو سابقہ فاٹا علاقوں میں قائم ان کیمپوں کی جانب سفر کرتے ہوئے خطرات لاحق رہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں نے کیمپوں اور متاثرہ علاقوں تک رسائی مقامی این جی اوز کے ذریعے قائم رکھی۔

غیر رضاکارانہ واپسی کی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں۔ اطلاعات کے مطابق دربدر ہونے والے کئی افراد بنیادی ڈھانچے کی قلت، رہائش کی کمی، خدمات کی عدم دستیابی اور واپس جانے والوں کی نقل وحرکت پر چیک پوسٹوں کے ذریعے سیکورٹی فورسز کے سخت کنٹرول کے باوجود گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے۔ دیگر بے گھر ہونے والے خاندانوں نے یا تو واپسی کو ملتوی کیا یا انہوں نے خیبر پختونخوا کے ان علاقوں میں، جہاں صحت، تعلیم اور دیگر سماجی خدمات دستیاب تھیں، رہنے کے لئے اپنے بعض اہل خانہ کا انتخاب کیا۔ مقامی طور پر بے گھر ہونے والے ایسے افراد کے لئے جو واپسی پر آمادہ نہیں تھے یا واپس جانے کے قابل نہیں تھے، حکومت نے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی اداروں کے تعاون سے امداد فراہم کی۔ قدرتی آفات اور دہشت گرد سرگرمیوں اور دہشت گردوں کے خاتمہ کی کارروائیوں کے نتیجہ میں افراد کے بڑے پیمانے پر بے گھر ہونے کے باوجود حکومت نے اُن لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے کوئی خاص قانون سازی نہیں کی۔ اس کے علاوہ نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ ایکٹ ۲۰۱۰ء آئی ڈی پیز یا ان کے حقوق کی کوئی مخصوص تعریف بیان نہیں کرتا۔

پناہ گزینوں کا تحفظ

حکومت نے ۱۴ لاکھ اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد، پناہ گزینوں، واپس جانے والے مہاجرین، پناہ مانگنے والوں اور ایسے دیگر افراد کے، جن کی جانوں کو خطرات لاحق تھے، تحفظ اور معاونت کے لئے اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزین (یو این ایچ سی آر) کے دفتر اور انسانی بنیادوں پر کام کرنے والے دیگر اداروں سے تعاون کیا۔

تارکین وطن، پناہ گزین اور بے وطن افراد سے بدسلوکی: حکومت نے باقاعدہ طور پر اندراج کردہ اور رجسٹریشن کارڈز (پی او آر) کے حامل لگ بھگ ۱۴ لاکھ افغانیوں کو عارضی قانونی حیثیت فراہم کی۔ ۳۰ جون کو پی او آر کی مدت ختم ہوئی اور دسمبر تک کی اطلاعات کے مطابق پی ٹی آئی کی قیادت میں قائم حکومت نے ماضی میں لمبی توسیع کی اپنی روایت کے برخلاف اس مرتبہ اُن کی مدت بڑھانے سے انکار کر دیا۔ تاہم جون میں حکومت نے نوٹیفکیشن جاری کرتے ہوئے تمام سرکاری اداروں کو متنبہ کیا کہ وفاقی کابینہ کا حتمی فیصلہ صادر ہونے تک پی او آر کے حامل افغانوں کو تنگ نہ کیا جائے۔ پاکستان افغان سٹیزن کارڈز کے حامل ۸ لاکھ ۷۸ ہزار افغان شہریوں کی میزبانی بھی کرتا ہے لیکن اُن کو پناہ گزین کی حیثیت حاصل نہیں۔ حکومت افغان سٹیزن کارڈ کی مدت چھوٹے چھوٹے مرحلوں میں بڑھا دیتی ہے لیکن اس مرتبہ اِن کو جون ۳۰ تک ختم ہونے دیا گیا۔

کرونا وائرس وبا کی وجہ سے ماضی کی نسبت موجودہ سال پناہ گزینوں کی کم گرفتاریاں واقع ہوئیں تاہم صوبائی حکام، پولیس اور میزبان برادریوں نے افغان پناہ گزینوں کو ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یو این ایچ سی آر کے مطابق جنوری سے اگست تک ۳۷۰ پناہ گزینوں کو گرفتار کرنے یا حراست میں لینے کے واقعات ہوئے۔

پناہ تک رسائی: قانون پناہ یا پناہ گزینی کا درجہ فراہم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ملک میں پناہ گزینوں اور ترک وطن کے لئے قانونی ڈھانچہ کی کمی ہے۔ قانون غیر قانونی داخلے یا غیر قانونی طور پر رہنے سے متعلق قانونی دفعات سے پناہ کے خواہشمند افراد اور پناہ گزینوں میں تخصیص نہیں کرتا۔ پناہ گزینوں سے متعلق قومی قانونی ڈھانچے کی عدم موجودگی میں یو این ایچ سی آر نے اپنے مینڈیٹ کے تحت پناہ گزین درجہ کا تعین کیا اور ملک میں پناہ گزین کا درجہ دینے سے متعلق یو این ایچ سی آر کے فیصلوں کو عمومی طور پر تسلیم کیا

گیااور پناہ کے درخواست گزاروں، جو اس عمل سے گزر رہے تھے اور وہ جنہیں پناہ گزین تسلیم کر لیا گیا تھا، دونوں کو دیرپا حل کی نشاندہی تک ملک میں رہنے کی اجازت دی۔

روزگار: ایسی کوئی باقاعدہ دستاویز نہیں جس کے تحت پناہ گزینوں کو کام کرنے کی قانونی اجازت حاصل ہو، تاہم ایسا کوئی قانون بھی نہیں جو پناہ گزینوں کو ملک میں کام کرنے کی ممانعت کرتا ہو۔ کئی پناہ گزین یومیہ اجرت کے ملازمین کی حیثیت سے کام کرتے رہے یا غیر رسمی منڈیوں میں کام کر رہے تھے اور مقامی آجرین نے ان منڈیوں میں کم اجرت یا بغیر اجرت کی فراہمی کے ذریعے پناہ گزینوں کا استحصال کیا۔ خواتین اور بچے بالخصوص اس صورتحال کا شکار رہے اور کم اجرت اور ناپسندیدہ کام کرنے پر مجبور رہے۔

بنیادی سہولتوں تک رسائی: رجسٹرڈ افغانوں میں سے ایک تہائی کی رہائش ۵۴ پناہ گزین دیہات میں تھی جبکہ بقیہ دو تہائی تعداد دیہی اور شہری علاقوں میں میزبان آبادیوں میں رہائش پذیر رہی اور انہی آبادیوں میں بنیادی خدمات تک رسائی کی متلاشی رہی۔ افغان پناہ گزین پولیس اور عدالتوں کی خدمات اپنے لئے حاصل کر سکتے تھے، لیکن بعض بالخصوص غریب لوگ ایسا کرنے سے خوفزدہ رہے۔ قومیت کی وجہ سے کسی کو صحت کی سہولتوں کی فراہمی سے انکار کی اطلاعات موصول نہیں ہوئیں۔ ۲۰۱۹ء میں حکومت نے رجسٹریشن کارڈ کی بنیاد پر افغان شہریوں کو بینک اکاؤنٹ کھولنے کی اجازت دی۔

آئین پانچ سے سولہ برس کی عمر کے تمام بچوں کو قومیت سے قطع نظر مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ بظاہر تو ہر پناہ گزین بچہ، جو یو این ایچ سی آر اور افغان پناہ گزینوں کے حکومتی زیر انتظام کمشنریٹ میں رجسٹرڈ ہو، مطلوبہ کاغذی کارروائی کے بعد سرکاری تعلیمی اداروں میں داخل تھا۔ تاہم اسکولوں تک رسائی پرنسپل کی نشاندہی کردہ آسامی کے تعین پر منحصر تھی اور بیشتر رجسٹرڈ افغان پناہ گزین بچے نجی اسکولوں یا بین الاقوامی برادری کے تعاون سے چلنے والے اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ پناہ گزین بستیوں میں بڑی عمر کے طالبعلموں خاص طور پر لڑکیوں کے لیے حصول تعلیم مشکل ہے۔ افغان مہاجرین یونیورسٹیوں میں داخلہ کے لیے رجسٹریشن کارڈ بطور ثبوت استعمال کر سکتے تھے لیکن اطلاعات کے مطابق جون ۲۰۲۰ء میں اندراج کارڈ کی مدت کے خاتمہ

کے بعد مقامی جامعات نے افغان طالبعلموں کو داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔ دوسری جانب، افغان طالبعلم پاکستان کے سرکاری و نجی کالجوں اور جامعات میں داخلے کے حصول کے لئے اہل تھے۔

پائیدار حل: حکومت نے دیگر ممالک سے پناہ گزین آباد ہونے کے لئے قبول نہیں کیے اور نہ ہی ان کی مقامی آبادی میں انضمام میں مدد کی۔ حکومت فی الوقت افغان مہاجرین کے بچوں کو پاکستانی شہریت نہیں دیتی تاہم افغان پناہ گزینوں اور دیگر بے وطن افراد کے پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں کو شہریت دینے کے امکان کا جائزہ لینے کے لئے ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی ہے۔

بے وطن افراد

بے وطنی ایک بڑا مسئلہ بنی رہی۔ بے وطنی کے بارے میں کوئی بھی قانون سازی موجود نہیں ہے اور حکومت بے وطن افراد کے وجود سے انکاری ہے۔ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کے بالترتیب، پاکستان۔ بھارت اور پاکستان۔ بنگلا دیش تقسیم کے نتیجے میں بین الاقوامی اور قومی اداروں کے اندازے کے مطابق ہزاروں بے وطن لوگوں کی ملک میں موجودگی کے امکانات تھے۔ اس کے علاوہ یو این ایچ سی آر نے اندازہ لگایا کہ ملک میں بڑی تعداد میں روہنگیا، بہاری اور بنگالی باشندے رہائش پذیر تھے، جن کی بڑی تعداد کے بارے میں بے وطن ہونے کا گمان ہے، اگرچہ اُن کے بارے میں جامع اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔

حصہ سوئم: سیاسی عمل میں شرکت کی آزادی

آئین شہریوں کی اکثریت کو غیر جانبدار اور منصفانہ خفیہ ووٹ کے ذریعے انتخابات میں اپنی مرضی کی حکومت منتخب کرنے کا حق دیتا ہے، جو کہ عام اور مساوی رائے دہی کے حقوق کے عین مطابق ہے۔ گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر میں باقی ملک سے مختلف سیاسی نظام نافذ ہیں اور دونوں کو قومی پارلیمان میں نمائندگی حاصل نہیں۔

انتخابات اور سیاسی شمولیت

حالیہ انتخابات: جولائی ۲۰۱۸ء میں ملک میں براہ راست انتخابات کے نتیجہ میں وزیر اعظم عمران خان کی قیادت میں پی ٹی آئی کی اکثریتی حکومت قائم ہوئی۔ یورپی یونین کے مبصروں کی رائے کے مطابق ووٹ ڈالنے کا عمل "منظم اور شفاف" تھا لیکن انہوں نے کہا کہ "ووٹوں کی گنتی بعض اوقات مسائل سے دوچار" تھی۔ سول سوسائٹی کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں نے قبل از انتخاب مداخلت بشمول اظہار رائے کی آزادی پر پابندیوں پر اپنی تشویش کا اظہار کیا جس سے مبینہ طور پر ناہموار انتخابی میدان وجود میں آیا۔

ستمبر ۲۰۱۸ء میں الیکٹورل کالج (جو کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران پر مشتمل تھا) نے خفیہ رائے دہی کے ذریعے صدارتی انتخابات کا انعقاد کرتے ہوئے مسلم لیگ نون کے ممنون حسین کی جگہ پر پی ٹی آئی کے عارف علوی کو ملک کا نیا صدر منتخب کیا

پچیسویں آئینی ترمیم پاس ہوتے ہی سابقہ قبائلی علاقہ جات کو کے پی کے میں شامل کر کے حکومت نے ۲۰۱۹ء میں خُصوصی انتخابات کا انعقاد کر کے سابقہ فاٹا کے شہریوں کو کے پی کے صوبائی اسمبلی میں نمائندگی دے کر تاریخ رقم کی۔ سیاسی طور فاٹا کے خیبر پختونخوا میں مکمل انضمام میں رکاوٹ اب مقامی نمائندوں کے انتخابات کے انعقاد کا التواء ہے۔ ۱۵ نومبر کو گلگت بلتستان قانون ساز اسمبلی کے انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ غیر سرکاری نتائج کے مطابق پی ٹی آئی نے ۲۴ میں سے دس نشستیں جیتیں جو کہ کسی بھی جماعت کی حکومت تشکیل دینے کے لیے درکار مناسب تعداد ہے۔ شروع میں اگست میں مقرر شدہ یہ انتخابات کووڈ وبا کی وجہ سے ملتوی کے گئے۔ حزب اختلاف کی جماعتوں مسلم لیگ۔ نون، پی پی پی نے انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگایا اگرچہ فری اینڈ فیئر نیٹ ورک کے سربراہ نے انتخابات کو شفاف اور غیر جانبدار قرار دیا۔

سیاسی جماعتیں اور سیاست میں شمولیت: انتخابات میں دہشتگرد گروہوں کے ساتھ تعلق کے باعث کالعدم قرار دی گئی تنظیموں کے علاوہ کسی بھی سیاسی جماعت پر پابندی کی اطلاعات موجود نہیں تھیں۔

اکتوبر ۱۵ کو حزب اختلاف نے حکام پر گوجرانوالہ میں اگلے روز طے شدہ احتجاجی جلسہ سے قبل چار سو کارکنان کو گرفتار کرنے کا الزام عائد کیا۔ متحدہ قومی موومنٹ پاکستان نے الزام لگایا کہ پولیس اور دیگر سلامتی کے اداروں نے اُس کے کارکنوں کو شناخت کے بہانے سے حراست میں لینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ دریں اثنا مئی میں حکومت نے سندھی قوم پرست جماعت جئے سندھ قومی محاذ آزادی پر پابندی عائد کر دی۔ ہیومن رائیٹس کمیشن آف پاکستان سمیت غیر سرکاری تنظیموں نے پابندی کے اطلاق پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ حکومت ایسی پابندیاں لگانے سے قبل سیاسی جماعتوں اور دہشتگرد تنظیموں کے درمیان تفریق کے معیار کی پاسداری کرے۔ ایم کیو ایم لندن نے الزام لگایا کہ سیکیورٹی ادارے اُس کے بانی الطاف حسین کی حمایت کرنے پر کارکنوں کو گرفتار کرتے ہیں۔

خیبر پختونخوا پولیس نے پی ڈی ایم کی مقامی قیادت کو ضلعی انتظامیہ کی طرف سے اجازت نہ ملنے کے باوجود ریلی منعقد کرتے ہوئے کرونا وبا کی احتیاطی تدابیر کی خلاف ورزی پر ۲۲ نومبر کی حکومت مخالف ریلی کا انتظام کرنے والے سیاسی کارکنوں کے خلاف قانونی کارروائی کی۔

ججوں نے ذرائع ابلاغ کی نگرانی کے اداروں کو فوج اور عدلیہ مخالف مواد کی نشریات پر پابندی کا حکم دیتے ہوئے ذرائع ابلاغ کو سیاستدانوں کی "عدلیہ مخالف" اور "فوج مخالف" تقاریر اور انتخابی سرگرمیوں کی کوریج روکنے پر مجبور کیا۔ ذرائع ابلاغ کی آزادی کے حوالے سے کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیموں کی رپورٹوں کے مطابق میڈیا کے اداروں پر اس حوالے سے براہ راست دباؤ تھا کہ سیاست دانوں کے خلاف قانونی کارروائی کے لیئے عدلیہ پر ممکنہ عسکری اثر ورسوخ کے بارے میں مواد نشر نہ کیا جائے اور یہ بھی کہ نواز لیگ کے سیاسی رہنماؤں کے بارے میں مثبت خبریں نہ چلائی جائیں۔ بہت سے علاقوں میں سیاسی جماعتوں اور امیدواروں پر اکثر علاقوں میں اجتماع کرنے، انتخابات میں حصہ لینے یا ووٹ حاصل کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بلوچستان میں، اگرچہ رپورٹیں

تھی کہ سیکیورٹی ایجنسیوں اور علیحدگی پسند گروپوں نے مقامی سیاسی تنظیموں جیسا کہ بلوچستان نیشنل پارٹی اور بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کو ہراساں کیا۔ ۲۰۱۷ء میں پاس ہونے والے جامع انتخابات ایکٹ میں خواتین، مذہبی اقلیتوں، خواجہ سراؤں اور معذور افراد کی انتخابی عمل میں شرکت میں اضافے کے لیے خصوصی اقدامات پر زور دیا گیا ہے۔ نئے قانون کے تحت پارٹی کے پانچ فیصد ٹکٹ لازمی طور پر خواتین کو دیے جائیں اور اگر کسی حلقہ میں دس فیصد سے کم خواتین ووٹ ڈالتی ہیں تو یہ تصور کیا جائے گا کہ عورتوں کے ووٹ کو دبایا گیا ہے اور اس حلقے یا پولنگ اسٹیشن کے نتائج مسترد کئے جا سکتے ہیں۔ حکومت کی جانب سے اس قانون پر پہلی بار خیبر پختونخوا کے علاقہ شانگلہ میں اس وقت عمل درآمد ہوا جب الیکشن کمیشن نے ضلع میں ۲۰۱۸ء کے عام انتخابات کے نتائج اس بنیاد پر مسترد کر دیے کہ خواتین کے ڈالے گئے ووٹ دس فیصد سے کم تھے۔

قبائلی اور دیہی علاقوں میں رائج روایتی اور ثقافتی رسم و رواج نے کچھ عورتوں کو ووٹنگ میں حصہ لینے سے دور رکھا۔ حکام نے منتخب اداروں میں عورتوں کی کم از کم موجودگی یقینی بنانے کے لیے وسیع طور پر کوٹہ سسٹم کا استعمال کیا۔ قومی اسمبلی میں عورتوں کے لیے ۶۰ اور سینیٹ میں ۱۷ مخصوص نشستیں ہیں۔ حکام نے ان نشستوں کو ہر پارٹی کی جانب سے الیکشن لڑ کر کامیاب ہونے والے امیدوار کی جانب سے حاصل کیے گئے ووٹوں کی بنیاد پر تقسیم کیا۔ خواتین اور اقلیتیں براہ راست انتخاب بھی لڑ سکتے ہیں لیکن دونوں نے ہمیشہ مخصوص نشستوں سے ہٹ کر براہ راست منتخب ہونے کی جدوجہد کی ہے۔ حکام نے صوبائی اسمبلی کی ۷۷۹ میں سے ۱۳۲ سیٹیں خواتین کے لئے مختص کیں اور مقامی کونسلوں میں ایک تہائی نشستیں فراہم کیں۔ خواتین نے بطور سیاسی جماعتوں کے کارکن سرگرم کردار ادا کیا لیکن وہ سیاسی جماعتوں میں ماسوائے خواتین ونگ کی سربراہی سطح کے عہدے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں رہیں۔ خواتین نے وفاقی کابینہ میں بھی خدمات سرانجام دیں۔

قانون غیر مسلم، خواجہ سراؤں اور معذوروں کو قومی شناختی کارڈ (جو ووٹر کی شناختی دستاویز کے طور پر استعمال ہوتا ہے) کے جلد از جلد اجراء پر زور دیتا ہے۔

حکومت ووٹروں پر لازمی قرار دیتی ہے کہ ووٹ کا اندراج کراتے وقت اپنا مذہب ظاہر کریں۔ احمدیوں پر حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا حلف لینے یا احمدی تحریک کے سربراہ کا انکار کرنے یا خود کو غیر مسلم قرار دینے کی شرط لاگو ہوتی ہے۔ احمدی خود کو مسلمان سمجھتے ہیں لیکن ان میں سے بہت سارے مذکورہ قانون کی پاسداری نہ کرنے کے باعث حق رائے دہی استعمال کرنے سے رہ گئے۔

سیکشن چہارم: بدعنوانی اور حکومتی اُمور میں عدم شفافیت

قانون بدعنوان افسران کے خلاف مجرمانہ سزاؤں پر زور دیتا ہے، لیکن حکومت نے اس قانون کو مؤثر طریقے سے نافذ نہیں کیا اور افسران اکثر و بیشتر بدعنوانی کے عمل میں ملوث رہے۔ سیاست اور حکومت میں کرپشن چھائی ہوئی تھی اور مختلف سیاستدانوں اور سرکاری عہدیداروں پر رشوت خوری، بھتہ خوری، نااہل رشتہ داروں اور ساتھیوں کی تقرری، اقرباء پروری، جرائم کی سرپرستی، دھوکہ دہی اور خُرد برد کے الزامات تھے۔

قومی احتساب بیورو (نیب) اعلیٰ سطح کے انسداد بدعنوانی ادارے کے طور پر خدمت سرانجام دیتا ہے، جس کا مینڈیٹ آگہی، روک تھام اور نفاذ قانون کے اقدامات کی توسط سے بدعنوانی کا خاتمہ کرنا ہے۔ نیب اور دوسرے تفتیشی ادارے بشمول وفاقی ریوینیو بورڈ، بینک دولت پاکستان، اینٹی نارکوٹکس فورس اور وفاقی تحقیقاتی ادارہ (ایف آئی اے) کرپشن، ٹیکس چوری اور منی لانڈرنگ کے جرائم کی تحقیقات کرتے ہیں۔

بدعنوانی: ۲۷ اگست کو مقامی نشریاتی ادارے فیکٹ فوکسڈ نے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل عاصم سلیم باجوہ کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ فوج میں اپنے عہدے کے ذریعہ اُنہوں نے ایک وسیع خاندانی کاروبار قائم کیا۔ رپورٹ کے رد عمل میں باجوہ نے وزیراعظم کے مشیر برائے اطلاعات و نشریات کے عہدہ سے استعفیٰ دیا تاہم وہ چین پاکستان اقتصادی راہداری کے چیئرمین کے طور پر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ۲۷ جولائی کو افغانستان۔ پاکستان تجارت میں مصروف عمل ٹرانسپورٹرز نے لنڈی کوتل کے مقام پر دھرنا دیکر طورخم سرحد بند کر دی۔ مظاہرین نے خیبر پختونخوا پولیس اور حکام پر الزام عائد کیا کہ وہ نام نہاد یونین نمائندوں اور نجی

جرائم پیشہ گروہوں کے ذریعے طورخم سرحد سے تیس کلومیٹر فاصلہ پر قائم باڑاٹرک پارکنگ پر رشوت اور بھتہ وصول کررہے ہیں۔ سول سوسائٹی کے نمائندوں کے اندازہ کے مطابق باڑا میں یومیہ آٹھ سو سے ایک ہزار ٹرک پارکنگ کرتے ہیں، جس کی وجہ کرونا وائرس وبا کے دوران پابندیوں کی وجہ سے رُکی ہوئی مال برداری اور کاغذی کارروائیوں میں سست روی ہے۔

سال کے دوران حکومت نے بدعنوانی کے خلاف تحقیقات اور مخالف سیاسی رہنماؤں کے خلاف اقدامات جاری رکھے، جن میں سابق وزیراعظم نواز شریف اور سابق صدر آصف زرداری کے خلاف بڑی سطح کے اقدامات شامل تھے جبکہ حزب اختلاف کی دیگر جماعتوں بشمول جی یوآئی ایف کے ارکان کے خلاف بھی کارروائی جاری رہی۔ حزب اختلاف نے ان قانونی کارروائیوں کو اپنی قیادت کے خلاف امتیازی سلوک قرار دیا۔

عدالتی نظام میں کورٹ اسٹاف کی جانب سے چھوٹے پیمانے پر سہو نگاری کے لیے ادائیگیوں کے مطالبے سمیت، کرپشن کی رپورٹیں موجود تھیں۔ ماتحت عدالتیں مبینہ طور پر کرپٹ، غیر موثر رہیں اور اعلیٰ سطحی ججوں، معروف افراد وامراء، مذہبی اور سیاسی شخصیتوں کے دباؤ کا شکار تھیں۔

مالی اُمور کا انکشاف: قانون کے مطابق پارلیمینٹ کے ارکان، سرکاری ملازمین اور وزیر لازمی طور اپنے اثاثے ظاہر کریں۔ منتخب عہدیدار اپنی بیویوں اور زیر کفالت بچوں کے اثاثے بھی ضرور ظاہر کریں۔ اس معلومات کو ظاہر کرنے میں ناکامی ان کو عوامی عہدوں سے پانچ سال کے لیے نااہل قرار دلوا سکتی ہے۔ تاہم ریاست کے سربراہ اپنی آمدنی اور اثاثے ظاہر کرنے کے پابند نہیں تھے۔ ججوں، جرنیلوں اور اعلیٰ سطحی افسران کے اثاثے اکثر عوام سے چھپے ہوئے تھے۔ خیبر پختونخوا میں میڈیا نے قانون سازوں اور صوبائی حکام کی جانب سے اثاثے ظاہر کرنے کے حوالہ سے سرگرمی سے خبریں دیں۔

سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اثاثے اور قرضے ظاہر کر کہ اپنا سالانہ مالی کھاتہ رپورٹ جمع کرائیں۔ حکومت نے مذکورہ قانون مکمل طور پر نافذ نہیں کیا جبکہ متعدد قانون سازوں نے بھی اکثر اس کو نظرانداز کیا۔ اس امر کو یقینی بنانا الیکشن کمیشن آف پاکستان کی ذمہ داری ہے کہ سیاسی جماعتیں اور سیاستدان اپنے مالی معاملات کی معلومات کی عوام کے سامنے تصدیق کریں۔ کمیشن ممبران پارلمینٹ کے اثاثوں کی سالانہ فہرست شائع کرتا ہے۔

اہلیت اور ضوابط قوانین کے تحت بدعنوانی اور مالی بے ضابطگیوں کے الزامات کی صورت میں کوئی بھی افسر تفتیش کا سامنا کرے گا۔ بدعنوانی کا مرتکب افسر ۱۴ سال قید، جرمانہ، یا دونوں سزائیں پا سکتا ہے اور حکومت کرپشن کے ذرائع سے بنائی گئی جائداد ضبط کر سکتی ہے۔

سیکشن پنجم: انسانی حقوق کی مبینہ خلاف ورزیوں کی بین الاقوامی اور غیر سرکاری تفتیش کے حوالے سے حکومتی رویہ

انسانی حُقوق کے بعض مقامی اور بین الاقوامی ادارے کسی نمایاں حکومتی پابندی کے بغیر فعال تھے اور وہ انسانی حقوق کے حوالہ سے اپنی تحقیقات اور واقعات کی رپورٹیں شائع کرتے رہے۔ حکومت نے این جی اوز کے کام کی استعداد کو مسلسل کم کرنے کی کوشش کی خاص طور پر اُن اداروں کی جو حکومت، فوج اور حساس اداروں کی کوتاہیوں یا غلط اقدامات کی نشاندہی کرنے میں ملوث تھے یا پھر بدامنی کے شکار علاقوں میں سرگرم یا وہاں کسی مہم میں مصروف تنظیمیں۔ ان گروپس کو ویزہ کے حصول، سفر اور رجسٹریشن کے معاملات میں کئی سخت ضوابط کا سامنا کرنا پڑا جس کے باعث ان کی کارکردگی اور عطیات کا حصول متاثر ہوا۔ تنظیموں بشمول کامیابی سے نئی رجسٹر ہونے والی بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے غیر ملکی اسٹاف ممبران کو اندرون ملک سفر کے لیے ویزا اور این او سی کے حصول کے لیے مشکلات یا انکار کا سامنا کرنا پڑا۔ مقامی این جی اوز کی رجسٹریشن کے معاہدے کے تحت تمام غیر سرکاری تنظیمیں اپنے دستاویزات اور سالانہ رپورٹوں میں ایسے الفاظ یا ترکیبوں کا استعمال نہیں کریں گی جو حکومت کے نزدیک متنازعہ ہیں جیسا کہ انسداد شدت پسندی، قیام امن و تنازعات کا خاتمہ، اندرون ملک بے گھر افراد، تولیدی صحت، ہم جنس پرست افراد۔ معاہدے کی رُو سے یہ ادارے بھارتی یا اسرائیلی شہریت رکھنے والے افراد کو ملازمت فراہم نہیں کر سکتے۔ محض چند این جی اوز کو صوبہ خیبر پختونخوا، سابقہ قبائلی علاقوں اور بلوچستان کے کچھ علاقوں تک رسائی حاصل تھی۔

انسانی حقوق کی حکومتی تنظیمیں: ۲۰۱۲ء میں منظور شدہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق بل قومی کمیشن برائے انسانی حقوق کے نام سے ایک آزاد کمیٹی کی تشکیل کی اجازت دیتا ہے۔ کمیشن کی پہلی مدت جون ۲۰۱۹ء میں اختتام پذیر ہو چکی تھی تاہم حکام نے ستمبر تک دوسرا کمیشن قائم نہیں کیا تھا۔ ۲۰۱۵ء میں ایک غیر جانبدار وزارت انسانی حقوق کی بھی تشکیل نو کی گئی تھی۔ سینیٹ اور قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹیوں برائے قانون، انصاف، اقلیتی اُمور اور حقوق انسانی نے درپیش مسائل پر متعدد سماعتیں منعقد کیں۔

سیکشن ششم: امتیازی سلوک، معاشرتی بدسلوکی اور بردہ فروشی

خواتین

عصمت دری اور گھریلو تشدد: عصمت دری ایک سنگین جرم ہے جسکی پاداش میں دس سے پچیس سال قید، جرمانہ اور بعض صورتوں میں پھانسی کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اجتماعی زیادتی کی سزا عمر قید یا سزائے موت ہے۔ قانون شریک حیات سے جنسی زیادتی کو خصوصی جنسی جرم قرار نہیں دیا دیتا اور عصمت دری کو کسی بھی مرد کی جانب سے عورت کے خلاف کیا جانے والا جرم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ جنسی زیادتی کے واقعات بار بار ہوتے رہے مگر استغاثہ کی شرح کم تھی۔ انسداد جنسی جرائم قانون واقعہ کا ڈی این اے حاصل کرنے، جنسی زیادتی کے متاثرہ فرد کا نام صیغہ راز میں رکھنے، متاثرہ فریق کو قانونی امداد کی فراہمی کا حق، متاثرہ خاتون فریق کے لیے رپورٹنگ کی ضرورتوں میں نرمی اور ذہنی اور جسمانی طور پر معذور کی عصمت دری کی سزاؤں میں اضافہ تجویز کرتا ہے۔

خواتین کے تحفظ کے قانون مجریہ ۲۰۰۶ء کو حکومت نے موثر طور پر نافذ نہیں کیا جس کی رُو سے عصمت دری کے جرم کو اسلامی عدالتوں کی بجائے فوجداری عدالتوں کے ماتحت لایا گیا تھا۔ قانونی طور پر پولیس ایک خاتون کو دیوانی عدالت کے جج کی منظوری کے بغیر رات کے وقت تھانے میں نہیں رکھ سکتی۔ قانون متاثرہ پارٹی کو حق دیتا ہے کہ وہ براہ راست سیشن جج سے دادرسی طلب کر سکتا ہے جو سنگین جرائم کے لیے ٹرائل کورٹ تصور کیا جاتا ہے۔ متاثرہ خاتون کا بیان لینے کے بعد، سیشن کورٹ باقاعدہ شکایت درج کرتا ہے، جس کے بعد پولیس گرفتاریاں عمل میں لا سکتی ہے۔ این جی اوز نے رپورٹ کیا کہ اس طریقہ ہائے کار نے جنسی زیادتی کے ان متاثرین کے لیے رکاوٹیں پیدا کیں، جو عدالت کی طرف سفر یا رسائی کی طاقت نہیں رکھتیں۔ جنسی زیادتی ایک ایسا جرم رہا جس کی بہت کم اطلاع دی گئی۔

پنجاب میں خواتین کے لیے تشدد سے بچاؤ کا ایکٹ گھریلو تشدد کے متاثرین کو زیادہ قانونی تحفظ، بشمول عدالتی حفاظتی احکامات اور ضلعی سطح کے نئے دارالامان تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ دارالامان خواتین کو بہت ساری خدمات، بشمول جرائم کی ایف آئی آر کی تکمیل، بنیادی طبّی امداد، طبّی معائنہ، بعد از صدمہ بحالی، مفت قانونی اعانت اور چھت فراہم کرتے ہیں۔

پنجاب حکومت نے صوبہ کی جامعات میں چار کیریئر مراکز، خواتین کو قانونی اور نفسیاتی مدد مہیا کرنے کے ایک درجن بحالی مراکز اور عورتوں اور بچوں کے لیے ہنگامی امدادی مراکز قائم کیے ہیں۔ حکومتِ پنجاب نے تلاش روزگار میں مصروف خواتین کو محفوظ اور معقول قیمت میں عارضی رہائش کی فراہمی میں مدد کے لیے ایک درجن اضلاع میں سولہ ہاسٹل اتھارٹیز بھی قائم کر چکی ہے۔ انہوں نے اضافی ۶۸ ڈے کیئر مراکز بھی قائم کیے، سال کے اختتام تک ڈے کیئر مراکز کی تعداد ۱۳۷ ہو گئی تھی۔ صوبائی حکومت نے پنجاب اسمال انڈسٹری کوآپریشن ڈیولپمینٹ بینک اور دیہی خواتین کی تربیت کے لیے کسان کی بیٹی سمیت خواتین کی معاشی بااختیاری کے منصوبے شروع کیے۔

لاہور میں صنفی بنیادوں پر تشدد کے مقدمات کے لیے خُصوصی عدالت فعال ہے۔ لاہور میں قائم عدالت ضلع میں سنگین نوعیت کے مقدمات جیسا کہ جنسی زیادتی کے پیچیدہ مقدمات کی سماعت اور عورتوں اور لڑکیوں کو تحفظ مہیا کرتی ہے۔

خیبر پختونخوا میں گھریلو تشدد کی روک تھام کا کوئی جامع قانون موجود نہیں ہے۔

نفاذ قانون کے بارے میں مرکزی معلوماتی نظام کی عدم موجودگی اور اطلاعات کے فقدان کے باعث صوبائی یا مقامی سطح پر جنسی زیادتیوں کے حوالہ سے اعداد و شمار موجود نہیں تھے۔

رپورٹ شدہ جنسی زیادتی کے واقعات میں قانونی کارروائی کبھی کبھار ہوئی، اگرچہ ایسی رپورٹیں موصول ہوئیں کہ جنسی زیادتی اور صنفی بنیاد پر تشدد کیخلاف عوام اور پولیس میں شعور اور اداروں کی استعداد کار میں اضافے کی کوششوں سے اس امر میں بہتری دیکھی گئی۔ پولیس اور این جی اوز کے مطابق، دیگر تنازعات میں ملوث افراد نے بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف جنسی زیادتی کے جھوٹے مقدمات دائر کیے، جس سے پولیس کی سچے واقعات کی نشاندہی کر کے قانونی چارہ جوئی کرنے کی صلاحیت متاثر ہوئی۔ این جی اوز نے پولیس پر الزام لگایا کہ اس نے بعض اوقات جنسی زیادتی کا ارتکاب کرنے والوں سے رشوت وصول کی اور متاثرین کا استحصال کیا اور انہیں دھمکایا کہ وہ الزام واپس لے لیں، خاص طور پر جب مجرموں کا تعلق کسی اثر ورسوخ والی برادری سے تھا۔ کچھ پولیس افسروں نے متاثرہ فریق سے جنسی زیادتی کا مقدمہ درج کرنے سے قبل رشوت طلب کی اور بسا اوقات تفتیش فقط خانہ پُری کے طور پر کی گئی۔ مزید براں جنسی زیادتی کے الزامات ماورائے قانون طریقوں سے حل کیے گئے جس میں کئی مرتبہ متاثرہ خاتون کی مجرم سے زبردستی شادی کروائی گئی۔

خواتین کے خلاف تشدد کے خاتمہ کے لیے آواز اٹھانے والی عورتوں کو پولیس عملداروں سمیت معاشرتی عناصر سے حراسگی کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے، این جی اوز کے مطابق، خواتین کے آگے آنے کی حوصلہ شکنی ہوئی۔

نو ستمبر کی علی الصبح لاہور کے بیرونی راستے پر خراب ہونے والی گاڑی میں گھس کر دو افراد نے لوٹ مار کے بعد خاتون کو دو بچوں کے سامنے جنسی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ابتداء میں ایک سینیئر پولیس افسر نے خاتون کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ رات کے اوقات میں گھر سے کیوں نکلی تھی۔ لیکن بعد میں پولیس نے ایک ملزم کو گرفتار کیا۔

بعد از زیادتی طبّی معائنہ کے رجحان میں اضافہ ہوا لیکن بہت سے علاقوں میں طبّی عملہ کے پاس مناسب تربیت یا آلات نہیں تھے جو کہ قانونی کارروائی میں مزید پیچیدگی کا باعث بنے۔ جنسی زیادتی کا شکار خواتین، خصوصاً دیہی خواتین کو علاج معالجے کی جامع سہولیات تک رسائی حاصل نہیں تھی۔ خواتین کے طبّی مراکز کم تعداد میں میسر تھے جنہیں وفاقی حکومت اور بین الاقوامی خیراتی ادارے معاونت فراہم کر رہے تھے۔ یہ مراکز مقامی مراکز کے ساتھ شراکت داری کے ذریعے جنسی زیادتی کی شکار خواتین کو بنیادی سہولیات کی فراہمی کا انتظام کرتے ہیں۔

گھریلو تشدد کا وقوع عام ہے لیکن اس کی روک تھام کا کوئی بھی وفاقی قانون موجود نہیں۔ پولیس گھریلو تشدد کے اقدامات کو تعزیراتی قانون میں حملہ اور جسمانی زخم سے معنون کرتی ہے۔ صوبائی قوانین گھریلو تشدد کی ممانعت کرتے ہیں۔ گھریلو تشدد میں مار پیٹ، اعضاء کا کاٹنا، خواتین کی ابرو یا بال مونڈھنا اور زیادہ سنگین صورتحال میں قتل شامل تھے۔ جہیز اور دیگر خاندانی تنازعات کا نتیجہ کبھی کبھار موت یا جلا کر یا تیزاب پھینک کر شکل بگاڑ دینے کی صورت میں نکلا۔

جن عورتوں نے ظلم کے خلاف مقدمہ درج کروانا چاہا ان کو گھمبیر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پولیس اور جج بعض اوقات گھریلو تشدد کے واقعات کو خاندانی تنازعات کے پس منظر میں دیکھ کر، کوئی قدم اٹھانے سے کتراتے تھے۔ فرد جرم عائد کرنے کے بجائے پولیس نے

فریقین کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ حکام جبر کا شکار عورتوں کو بدسلوکی کے مرتکب خاندانوں میں واپس کرنے کے دستور پر عمل پیرا رہی۔ مشرقی پنجاب میں کووڈ۔۱۹ لاک ڈائون کے دوران حکام نے گھریلو تشدد کے واقعات میں پچیس فیصد اضافہ کی اطلاع دی۔

صنفی بنیادوں پر تشدد اور بدسلوکی کی اطلاع دینے والی خواتین کے بارے میں منفی معاشرتی روایات کو توڑنے کے لیے حکومت نے خواتین کے لیے خصوصی پولیس اسٹیشن قائم کر کے خواتین اہلکار مقرر کیں تاکہ متاثرہ عورتوں کو ایسی محفوظ پناہ گاہیں میسر کی جا سکیں جہاں وہ محفوظ انداز میں شکایات درج کرواسکیں اور مقدمات رپورٹ کر سکیں۔ تاہم خواتین کے یہ پولیس اسٹیشن اسٹاف کی کمی اور محدود سامان کے ساتھ مشکلات کا شکار رہے۔

حکومت نے مشکلات کا شکار خواتین کے لیے ہنگامی مراکز کا انتظام بھی جاری رکھا، جن کے توسط سے، زیادتی کا شکار خواتین کو غیر سرکاری تنظیموں کی جانب مدد حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ سرکاری مالی امداد سے ملک بھر میں قائم شہید بینظیر بھٹو مراکز برائے خواتین نے قانونی امداد، طبّی علاج اور نفسیاتی مشاورت فراہم کی۔ یہ مراکز ایسی خواتین کو خدمات فراہم کرتے ہیں جو استحصال اور تشدد کا شکار تھیں۔ بعد ازاں متاثرین کو مختلف دارالامانوں کے حوالے کیا گیا، زیادتی کا شکار خواتین اور بچوں کے لیے یہ پناہ گاہیں ملک بھر میں سینکڑوں کی تعداد میں تھیں۔ ان اداروں نے خواتین کو طبّی علاج کی سہولت بھی فراہم کی۔ غیر سرکاری تنظیموں کے مطابق پناہ گاہوں میں دیگر سہولیات جیسا کہ قانونی مدد اور مشاورت فراہم نہیں کی گئی اور انہوں نے زنا کی ملزمان خواتین کے لیے بطور انتظار گاہ سہولت دی، جو کہ دراصل عصمت دری یا دیگر بدسلوکی کا شکار ہو کر وہاں پہنچتی ہیں۔

سرکاری مراکز میں جگہ، عملہ اور وسائل کی کمی تھی۔ متعدد پر ہجوم دارالامان بین الاقوامی طور طے شدہ معیار سے ہم آہنگ نہیں۔ بعض پناہ گاہوں میں نہانے، کپڑے دھونے کے سامان یا خواتین کی صفائی کی اشیاء تک میسر نہیں ہوتیں۔ بعض واقعات پناہ گاہوں میں مبینہ طور پر خواتین کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے اور عملہ نے خواتین کی نقل و حرکت پر پابندی لگائی یا اُن کو ظلم کرنے والوں کے پاس

واپس جانے پر مجبور کیا۔ پناہ گاہوں میں عورتوں کو بدکاری یا جنسی بد سلوکی کے استحصال کا نشانہ بنایا گیا۔ بعض دارالامانوں کے عملہ نے کچھ خواتین کے ساتھ اس بنیاد پر امتیازی سلوک کیا کہ وہ گھر سے بھاگ کر آنے والی خراب شہرت کی حامل عورتیں ہیں۔

خواتین کے ختنہ کا معاملہ: کوئی بھی ملکی قانون عورتوں کے ختنے کے حوالے سے رہنمائی فراہم نہیں کرتا۔ انسانی حقوق کے گروپوں اور ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق بہت سے داؤدی بوہرہ مسلمانوں نے عورتوں کے ختنہ کے مختلف طریقوں پر عملدرآمد کیا۔ کچھ داؤدی بوہرہ افراد نے کھلے عام اس موضوع پر بات چیت کی اور اس عمل کے خلاف آن لائن درخواستوں پر دستخط کیے۔ دیہی سندھ اور بلوچستان میں کچھ الگ تھلگ رہنے والے قبائل اور کمیونٹی بھی اس پر مبینہ طور پر عملدرآمد کرتے ہیں۔

دیگر خطرناک ثقافتی روایات: خواتین مختلف قسم کے سماجی تشدد اور بد سلوکی کا شکار بنتی رہتی ہیں، جن میں نام نہاد غیرت کے نام پر قتل، زبردستی شادی اور مذہب تبدیل کرنا، جبری تنہائی، اور قبائلی تنازعات کو حل کرنے کے لیے ملکیت کے طور پر استعمال کیا جانا شامل ہے۔

غیرت کے نام پر قتل کے حوالے سے ۲۰۰۴ء کا قانون، خواتین مخالف کارروائیوں کے انسداد کا ایکٹ ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۶ء کا تعزیراتی قانون ترمیم شدہ بعنوان غیرت کے نام پر جرائم، نام نہاد روایتوں کی بنیاد پر خواتین کے خلاف اقدامات کو جرم قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان قوانین کی موجودگی کے باوجود، سینکڑوں خواتین نام نہاد غیرت کے نام پر قتل ہوئیں اور بہت سارے واقعات کے مقدمات درج ہوئے نہ ہی کسی کو سزا دی گئی۔ اور کئی واقعات میں پولیس نے غیرت کے نام پر قتل میں ملوث مرد ملزم کو فرار ہونے کا موقع دیا۔ چونکہ ایسے واقعات خاندان کے اندر ہی رونما ہوتے ہیں، لہذا بہت سے مقدمات کا پتا ہی نہیں چلتا۔ پولیس اور این جی اوز نے اطلاع دی کہ ذرائع ابلاغ میں بڑھتی ہوئی کوریج نے قانون نافذ کرنے والے اداروں کو ان واقعات میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کے قابل بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

مئی میں خیبر پختونخوا کے علاقہ شمالی وزیرستان میں تین افراد نے دو بہنوں کی ایک شخص کے ساتھ بوسہ کی وڈیو منظر عام پر آنے کے بعد دونوں کو قتل کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق پولیس نے مقتولوں کے باپ، بھائی اور ایک اور مجرم کو گرفتار کیا۔ وڈیو میں نظر آنے والے ۲۸ سالہ شخص کو بھی حراست میں لیا گیا جس کی جان فحاشی کے بارے میں قبائلی روایات کی وجہ سے خطرہ میں تھی۔ قبائلی عمائدین اور منتخب نمائندوں کے اعتراضات کی وجہ سے پولیس نے سرسری تفتیش کی۔ ستمبر تک موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق مقدمہ ٹرائل کورٹ میں زیر التواء تھا۔

سندھ پولیس کی جانب سے شائع کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۹ء کے درمیان سندھ میں ۵۱۰ خواتین سمیت ۷۶۹ لوگ نام نہاد غیرت سے متعلق واقعات میں قتل ہوئے۔ رپورٹ کے مطابق پولیس نے ۶۴۹ ملزمان کے خلاف مجرمانہ کارروائیوں کے ثبوت پیش کیے تاہم عدالتوں نے ۱۹ مقدمات میں سزائیں سنائیں، جبکہ ۱۳۶ ملزمان کو رہا کر دیا گیا اور ستمبر تک کے اعداد وشمار کے مطابق ۴۹۴ مقدمات زیر التواء تھے۔ ۲۱ فیصد رہائی کی نسبت سزائیں دینے کی شرح صرف دو فیصد تھی۔ ۲۷ جون کو جامشورو میں پولیس نے غیرت کے نام پر سنگسار کر کے قتل کی جانے والی ۲۴ سالہ وزیراں چھچھر کی مسخ شدہ لاش برآمد کی۔ پوسٹ مارٹم کے مطابق قتل سے قبل اُس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی اور وہ حاملہ تھی۔ وزیراں کے والد نے اُس کے شوہر پر قتل کا الزام عائد کیا۔

قانون اپاہج کرنے یا جلانے والے آلات کے ذریعہ سے قتل کو جرم قرار دیتا ہے اور ملوث افراد کے خلاف سخت ترین سزائیں تجویز کرتا ہے۔ یہ اطلاعات تھیں کہ غیرت سے متعلقہ جرائم یا گھریلو تنازعات میں جسمانی نقصان، بشمول خواتین کے ناک اور کان کاٹنے یا چہرے پر تیزاب پھینکنے کے واقعات جاری رہے تاہم تعزیراتی اقدامات شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملے۔ ۲۰۱۶ء کا سندھ ہندو میرج ایکٹ اور ۲۰۱۷ء کا ہندو میرج ایکٹ (دیگر صوبوں میں قابل اطلاق) ہندو برادری کی شادیوں کا اندراج کرنے اور انہیں قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے قانونی طریقہ کار فراہم کرتا ہے۔ ہندو میرج ایکٹ مجریہ ۲۰۱۷ء کے مطابق کسی بھی ایک فریق کی جانب سے

ہندومت کے علاوہ کوئی دیگر مذہب اختیار کرنے کی صورت میں شادی ٹُوٹ جائے گی۔ بعض انسانی حقوق کے کارکنوں کے مطابق مذکورہ شِق نے جبری شادی اور زبردستی مذہب تبدیلی کے خلاف حکومتی اقدامات کو متاثر کیا۔ ہندو میرج ایکٹ مجریہ ۲۰۱۶ ءکا اطلاق سکھ برادری کی شادیوں پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب سکھ آنند کراج میرج ایکٹ ۲۰۱۸ءمقامی حکومتی نمائندوں کو سکھ مرد اور سکھ عورت کے درمیان کسی بھی سکھ آنند کراج کی جانب سے تصدیق شدہ شادی کا اندراج کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

خواتین مخالف روایات کے انسداد کا ترمیمی ایکٹ مجریہ ۲۰۱۶ءاُن تمام عورت مخالف روایات کو جرم اور قابل سزا قرار دیتا ہے جن میں کسی بھی دیوانی یا فوجداری مقدمہ کے تصفیہ کی غرض سے عورت کو شادی کے لیے پیش کیا جائے، عورت کو دھوکہ دہی یا غیر قانونی طریقوں سے منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کے حق وراثت سے محروم کیا جائے، اس کو دباؤ میں رکھا جائے یا کسی بھی طریقہ سے عورت کو زبردستی شادی کے لیے مجبور کیا جائے، یا قرآن پاک کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کیا جائے، ایسی شادی کا انتظام یا سہولت بہم پہنچائی جائے، بشمول قرآن پاک پر عورت سے یہ حلف لینے کے کہ وہ غیر شادی شدہ رہے گی اور جائداد میں حق وراثت طلب نہیں کرے گی، شامل ہیں۔ قانون کی طرف سے عائد کردہ پابندی کے باوجود کچھ علاقوں میں ان روایات پر عمل جاری رہا۔

قانون بچیوں کو بچوں کی بہ نسبت ملکیت میں آدھے حصے کا وارث بناتا ہے۔ بیویوں کو ان کے شوہر کی جائداد کا آٹھواں حصہ ورثہ میں ملتا ہے۔ عورتوں کو اکثر اپنے قانونی حق سے بہت کم حصہ دیا گیا۔ مزید برآں پیچیدہ خاندانی تنازعات اور عدالتی کارروائیوں کے اخراجات اور طول نے خواتین کو وراثت میں ناانصافی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی حوصلہ شکنی کی۔ سال کے دوران خیبر پختونخوا میں خواتین کے حق میراث کے تحفظ کا قانون پاس کیا گیا اور ایک خصوصی خاتون محتسب اعلیٰ خواتین کے حق میراث کے حوالہ سے شکایات کی سماعت، تفتیش اور اطلاق یقینی بنانے کے لیے مقرر کی گئی۔

ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں کے مطابق اماموں اور دیگر شادی رجسٹراروں نے اکثر نکاح ناموں میں ہیر پھیر کرتے ہوئے طلاق کی صورت میں خاتون کے حقوق کو محدود کیا۔ دیگر واقعات میں نکاح ناموں پر دستخط کرنے والی خواتین کو اُن کے مواد سے مکمل طور پر آگاہ نہیں کیا گیا۔

سول سوسائٹی کے مطابق پاکستان میں صرف سات فیصد خواتین کو مالی امور تک رسائی حاصل ہے اور خواتین کو قرض حاصل کرنے کی محدود سہولت میسر تھی۔

اطفال

پیدائش کا اندراج: پاکستان کی شہریت ملک میں پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہے تاہم سنہ ۲۰۰۰ء کے بعد بیرون ملک پیدا ہونے والے بچے کی شہریت پیڑھی سے اخذ کی جاتی ہے کہ بچے کا باپ یا ماں ملک کے شہری ہوں اور بچے کا مجاز حکام کے پاس اندراج موجود ہو۔ پناہ گزینوں اور بے وطن افراد کے بچے ملک میں پیدائش کے باوجود شہریت کے حق کے مجاز نہیں ہیں۔

تعلیم: ملکی آئین لازمی تعلیم کی ضمانت فراہم کرتا ہے جو حکومت کی جانب سے پانچ سے سولہ سال تک کی عمر کے بچوں کو بالکل مفت فراہم کی جائے۔ تاہم اس دفعہ کی موجودگی کے باوجود سرکاری اسکولوں میں والدین سے کتابوں، یونیفارم اور دیگر سامان کی مد میں پیسے وصول کیے گئے۔

لڑکیوں کے حصول تعلیم میں سب سے بڑی رکاوٹ اِمسال تعلیم کے نظام تک اُن کی رسائی تھی۔ ملک کے دیہی علاقوں میں سرکاری اسکولوں، خاص طور پر ابتدائی جماعتوں کے بعد، کا وجود ہی نہیں ہے اور اگر ہیں بھی تو وہ اتنے دور ہیں کہ لڑکیاں اکیلے وہاں کا سفر نہیں کر سکتیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے علیحدہ نظام تعلیم کی ثقافتی روایت کے باوجود حکومت اس حوالہ سے اقدامات لینے سے قاصر رہی اور لڑکیوں کو علیحدہ بیت الخلاء یا کلاس روم کی سہولت نہیں تھی اور لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کے لیے زیادہ اسکول موجود تھے۔ پرائمری، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں لڑکیوں کی حاضری کی شرح بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ بعض قبائلی اور ثقافتی عقیدے بھی لڑکیوں کے حصول تعلیم کی راہ میں رکاوٹ تھے۔

طبّی سہولیات: لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو سرکاری صحت مراکز تک رسائی حاصل تھی، اگرچہ ان کے خاندان والے بسااوقات لڑکیوں کی نسبت لڑکوں کو طبّی امداد کے لیے ترجیح دیتے ہیں۔

بچوں سے بدسلوکی: مارچ میں حکومت نے زینب الرٹ بل پاس کیا جو بچوں کے ساتھ زیادتیوں کو جرم قرار دیکر بچوں کے ساتھ زیادتی میں ملوث افراد کو عمر قید کی سزا صادر کرتا ہے۔ بچوں سے بدسلوکی عام تھی۔ آجروں نے، جو بعض جگہوں پر رشتہ دار تھے گھریلو ملازمین کے طور پر کام کرنے والی چھوٹی لڑکیوں اور لڑکوں کو مار پیٹ کر اور ان سے دیر تک کام کروا کر بدسلوکی کی۔ مذکورہ قانون پاس ہونے کے چھ ماہ بعد ایک ہزار ۴۸۹ مقدمات درج کیے گئے لیکن بیس فیصد سے کم مقدمات میں سزائیں سنائی گئیں۔

ایک آجر اور اُس کی اہلیہ نے ۳۱ مئی کو آٹھ سالہ کمسن غیر قانونی بھرتی شدہ لڑکی کو تشدد کا نشانہ بنانے کا اعتراف کیا۔ وہ تشدد کے دوسرے روز زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گئی۔ آجروں کے مطابق انہوں نے لڑکی کو اپنے پالتو طوطے آزاد کرنے پر مارا تھا۔ روات پولیس نے ایف آئی آر میں لکھا کہ لڑکی کے جسم پر ممکنہ جنسی حملہ سمیت مختلف حصوں پر تشدد کے نشانات تھے۔

اس طرح کے بہت سے بچے بردہ فروشی کا شکار بھی بنے۔ بعض واقعات میں فروخت شدہ بچوں کو اپنے آجروں کے لیے بھیک مانگنے پر مجبور کیا گیا۔

مقامی حکام نے بچوں کو تکلیف دہ رسومات کی بھینٹ چڑھایا، جس میں لڑکیوں کو تنازعہ کے تصفیہ اور واجب الادا قرض کے معاوضہ میں دینا شامل تھا۔ ۲۰۱۶ء میں حکومت نے زنا کے انسداد کے قانون میں ترمیم کی اور اس کی تشریح کو مزید وسعت دیکر سولہ سال کی لڑکی کے ساتھ جنسی زیادتی کے علاوہ لڑکوں کو بھی قانون میں بطور متاثرہ فریق شامل کیا۔

زبردستی اور کم عمری کی شادیاں: قانونی پابندیوں کے اطلاق کے باوجود بچوں کی شادیاں انجام پائیں۔ وفاقی قانون شادی کے لیے مردوں کی عمر اٹھارہ جبکہ لڑکیوں کی سولہ سال مقرر کرتا ہے۔ یونیسیف کے مطابق ملک میں اکیس فیصد لڑکیوں کی شادی اٹھارہ سال کی عمر ہی میں کی جاتی ہے۔ صوبہ سندھ میں سندھ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ ۲۰۱۴ء کے تحت لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کے لیے شادی کی قانونی عمر ۱۸ سال کر دی گئی ہے۔ ۲۰۱۷ء میں فوجداری قانون میں ترمیم کے تحت مذکورہ قانون کی پامالی کرنے والے کی سزا میں اضافہ کیا گیا۔ ترمیم کے تحت اب خلاف ورزی کرنے والے کو کم از کم پانچ سال اور زیادہ سے زیادہ دس سال تک (گزشتہ قانون میں ایک مہینہ تک سزا تھی) سزا ملے گی اور ماضی میں مقرر کردہ ایک ہزار روپے (چھ ڈالر) کی نسبت اب دس لاکھ روپے (چھ ہزار ۴۳۰ ڈالر) جرمانہ لاگو کیا جائے گا۔ تاہم مردوں نے دیگر صوبوں میں جا کر شادی کرتے ہوئے سندھ چائلڈ میرج ایکٹ کی خلاف ورزی کی۔

سنہ ۲۰۱۴ء میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بچپن میں شادی کی روک تھام کے قانون کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے فتویٰ دیا کہ مذکورہ قانون غیر منصفانہ ہے اور شادی کے لیے کوئی بھی قانونی عمر مقرر نہیں ہو سکتی۔ کونسل نے کہا کہ اسلام کم عمری کی شادی کی ممانعت نہیں کرتا کیوں کہ رخصتی تو دونوں شریک حیات کے بالغ ہونے پر ہی ہو سکتی ہے۔ کونسل کے فیصلے کو تسلیم کیا جانا لازم نہیں۔ دیہی علاقوں میں غریب والدین نے بعض اوقات اپنی بیٹیوں کو شادی کے لیے فروخت کیا اور بعض صورتوں میں قرض ادا کرنے یا تنازعات کے تصفیہ کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اگرچہ زبردستی کی شادی ایک سنگین جرم ہے اور بہت سے مقدمات بھی درج ہوئے لیکن اس کی انسداد کے لیئے قانونی چارہ جوئی کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔

جنوری پندرہ کو ایک پندرہ سالہ ہندو لڑکی مہک کماری گم ہونے کے بعد ایک مسلمان مرد علی رضا کے ساتھ وڈیو میں ظاہر ہوئی، جس میں دونوں نے رضامندی سے آپس میں شادی کرنے اور کماری کی جانب سے رضاکارانہ طور اسلام قبول کرنے کا دعویٰ کیا گیا۔ فروری میں کماری وڈیو میں دیئے گئے بیان سے مکر گئی اور علی رضا پر اغوا کا الزام لگاتے ہوئے واپس اپنے خاندان کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ردعمل میں بعض انتہا پسند مذہبی رہنماؤں نے کماری کو سزائے موت کی دھمکی دی۔ بعد ازاں رمضان کے مہینے میں جیکب آباد میں ایک عدالت نے فیصلہ دیا کہ سندھ چائلڈ میرج ریسٹرینٹ ایکٹ کے تحت مذکورہ جوڑے کی شادی کو غیر قانونی قرار دیا، جس کے تحت اٹھارہ سال سے کمسن بچوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔

کراچی سے تعلق رکھنے والی ۱۳سالہ عیسائی لڑکی آرزو راجا کو مبینہ طور اغوا کے بعد مسلمان کر کے اکتوبر ۱۳ کو ۴۴سالہ شخص سے بیاہ دیا گیا۔ سندھ ہائی کورٹ نے اکتوبر ۲۷ کو آرزو راجا کی شادی کو، اُس کی عمر اٹھارہ سال ہونے کی تصدیق کرنے والے دستاویزات کی بنیاد پر، برقرار رکھا اور کہا کہ اُس نے اپنی رضامندی سے اسلام قبول کر کہ شادی کی ہے۔ انسانی حقوق کے کارکنوں کی جانب سے درخواستوں کے بعد دو نومبر کو سندھ ہائی کورٹ نے آرزو کے شوہر کی گرفتاری اور معاملہ کی تفتیش مکمل ہونے تک اُس کو دارلامان میں رکھنے کا حکم دیا۔

بچوں کا جنسی استحصال: بچوں کو فحش فلمسازی، جنسی زیادتی، فحاشی کی ترغیب اور ظلم و ستم کے مخصوص جرائم سے محفوظ رکھنے کے لیے متعدد مقامی قوانین موجود ہیں تاہم وفاقی قوانین میں بچوں کی طوائف زنی اور فحش کاموں میں استعمال کی ممانعت شامل نہیں، حالانکہ عریانی و فحاشی سے متعلقہ قوانین کے تحت، بچوں کی فحش فلمیں بنانا غیر قانونی ہے۔ قانونی ماہرین کے مطابق حکام نے عام طور پر بچوں کے تحفظ کے قوانین لاگو نہیں کیے۔ مثال طور ایک مدرسہ کے استاد غلام عباس سہتو کو مسجد کے اندر بارہ سالہ بچے سے زیادتی کے الزام میں گرفتاری کے بعد ضمانت پر رہا کیا گیا، جبکہ ایک اور واقعہ میں سہتو کے خلاف کوئی بھی کارروائی یا سرکاری قدم نہیں اٹھایا گیا۔

کمسن بچوں کا قتل یا معذور بچوں کو مارنا: والدین نے بعض اوقات ناپسندیدہ بچوں کو لاوارث چھوڑ دیا، جن میں اکثریت لڑکیوں کی تھی۔ قانون کے مطابق، اگر کوئی کسی معصوم بچے کو ترک کر دیتا ہے تو اس کو سات سال تک قید کی سزا ہو سکتی ہے، جب کہ اگر کوئی معصوم بچے کو خفیہ طور پر دفناتے ہوئے پکڑا گیا تو اس کو دو سال قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ قتل کی سزا عمر قید ہے، لیکن حکام نے معصوموں کے قتل کے مقدمات میں کبھی کبھار ہی قانونی کارروائی کی۔

دربدر ہونے والے بچے: سول سوسائٹی کے ذرائع کے مطابق ماضی میں عسکری کارروائیوں کے نتیجہ میں متاثرہ بچوں کی آبائی علاقوں میں واپسی کے بعد حصول تعلیم اور نفسیاتی مدد تک رسائی مشکل تھی۔ تاہم کے پی حکومت نے سابقہ فاٹا میں اٹھارہ سو نئے

اسکول تعمیر کیے، جہاں پر اندرون ملک در بدر ہونے والے افراد کی بڑی تعداد کی واپسی ہوئی تھی۔ حکومت نے اسکولوں کی بحالی اور بچوں کے داخلہ پر توجہ دی اور بین الاقوامی تنظیموں کے مطابق ان اقدامات کے نتیجہ میں تعلیم سے محروم بچوں کی تعداد میں خاصی کمی واقع ہوئی۔

بچوں کے اغواء کے بین الاقوامی واقعات: پاکستان بچوں کے اغوا کی روک تھام کے دی ہیگ کنوینشن ۱۹۸۰ پر دستخط کرنے والے ممالک میں شامل ہے۔ والدین کی جانب سے بچوں کے اغوا کے واقعات کے بارے میں محکمہ خارجہ کی سالانہ بین الاقوامی رپورٹ مندرجہ ذیل لنک پر ملاحظہ کریں

https://travel.state.gov/content/travel/en/International-Parental-ChildAbduction/for-providers/legal-reports-and-data/reported-cases

یہودی مخالف جذبات

زیادہ تر یہودی ترک وطن کر چکے ہیں۔ قومی پریس میں یہودی مخالف جذبات کا اظہار عام تھا۔ روایتی ذرائع ابلاغ اور سماجی رابطوں کے ذرائع پر سیاستدانوں کی جانب سے نفرت انگیز نشریات میں گروہوں یا افراد کو نشانہ بناتے ہوئے "یہودی ایجنٹ" یا "صیہونی سازش" جیسے توہین آمیز اصطلاحات استعمال کی گئیں۔

انسانوں کی غیر قانونی منتقلی

اس حوالہ سے محکمہ خارجہ کی متعلقہ رپورٹ درج ذیل لنک پر ملاحضہ فرمائیں

https://www.state.gov/trafficking-in-persons-report/.

معذور افراد

قانون معذور افراد کو برابری کی بنیاد پر حقوق فراہم کرتا ہے اور صوبائی خصوصی تعلیم اور سماجی بہبود کے دفتر معذور افراد کے حقوق کے تحفظ کے ذمہ دار ہیں میں تاہم حکام نے ان قوانین کو سنجیدگی سے نافذ نہیں کیا۔ ہر صوبے کے پاس معذور افراد کے امسال کے حصول تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قانونی طور پر ذمہ دار دفتر یا محکمہ ہے۔ ان قوانین کے باوجود ، غیر سرکاری اداروں کے مطابق، خصوصی بچے اسکول نہیں جا سکے۔

وفاقی اور صوبائی سطح پر بھرتی کے کوٹا کے تحت کم از کم دو فیصد ملازمتیں معذوری کا شکار مگر قابل افراد کے لیے مختص کرنے کا قانون ہے تاہم نفاذ کے نظام کے ناقص ڈھانچے کے باعث حکام اس قانونی تقاضہ کا مکمل طور پر اطلاق نہیں کر پائے۔ جو ادارے معذور افراد کو بھرتی نہیں کرنا چاہتے تھے وہ متبادل کے طور پر معذور افراد کے لیے فنڈ میں جرمانہ ادا کر سکتے تھے۔ حکام نے کبھی کبھار اس ذمہ داری پر عمل درآمد کروایا۔ قومی کونسل برائے بحالیء معذور افراد نے ملازمتیں، قرض کی سہولت اور گزارے کے لیئے وظائف فراہم کیے۔ پولنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں مشکلات کی وجہ سے معذور افراد کے لیے انتخابات میں ووٹ ڈالنا بہر حال بہت مشکل عمل تھا۔ ۲۰۱۷ء کا الیکشن ایکٹ معذور افراد کی جانب سے بذریعہ ڈاک ووٹ ڈالنے کی اجازت دیتا ہے۔ بذریعہ ڈاک ووٹ دینے کی اہلیت کے لیئے معذور افراد کو مخصوص معذوری کے نشان والا شناختی کارڈ حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ معذور افراد کے حقوق کے لیئے کام کرنے والے کارکنوں کے مطابق پیچیدہ طریقہ کار کے باعث خصوصی کارڈ حاصل کرنا خاصہ اذیت ناک اور مشکل عمل ہے۔

جون میں این جی او ایچ آر سی پی نے معذور افراد کا نجی اور سرکاری کمپنیوں میں دو فیصد کوٹا ختم کرنے کی مذمت کی، جس کو کمپنیز ایکٹ ۲۰۱۷ء کی شق ۴۵۹ کو منسوخ کر کے ختم کیا گیا۔ تاہم انسانی حقوق کی وزیر نے دعویٰ کیا کہ شق کے خاتمہ سے ملازمتوں کے کوٹا کو خطرہ نہیں ہے۔ معذور افراد کے حقوق کے کارکنوں نے تمام فریقین سے رائے لیے بنا اور پارلیمانی بحث اور نگرانی کے بغیر جلد بازی میں کمپنیز ایکٹ میں ترمیم کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

جولائی میں سپریم کورٹ نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو حکم دیا کہ ملازمتوں، ٹرانسپورٹ، رہائش اور عوامی مقامات تک رسائی کو معذور افراد کے لیے قابل رسائی بنایا جائے۔ عدالت نے حکومت کو حکم دیا کہ معذور افراد کے لیے آسامیوں کا اشتہار دیکر اُن کو علاقائی کوٹا کے تحت بھرتی کیا جائے۔ اگست میں ایک اور حکم میں سپریم کورٹ نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو کہا کہ معذور، جسمانی طور معذور یا ذہنی معذور جیسی اصطلاحات کا استعمال ختم کیا جائے کیونکہ یہ سب خصوصی افراد کی عزت نفس کو مجروح کرتے ہیں۔

سترہ مارچ کو پنجاب کے صوبائی وزیر برائے اطلاعات اور ثقافتی امور فیاض الحسن چوہان نے معذور افراد کو والدین کے لیے سزا قرار دیا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ کرونا وائرس سے بچاؤ کی ترسیلات کی غیر قانونی ذخیرہ اندوزی میں ملوث افراد کو قدرت اپاہج اولاد عطا کر کہ اُن کے گناہوں کی سزا دے گی۔

قومی، نسلی، لسانی اقلیتوں کے ارکان

بعض سندھی اور بلوچ گروہوں نے دعویٰ کیا کہ حکام نے ان کے کارکنوں کو سیاسی وابستگی یا عقیدہ کی بنیاد پر حراست میں لیا ۔ سندھ کی قوم پرست جماعتوں نے مزید یہ بھی الزام لگایا کہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں نے سندھی سیاسی کارکنان کو اغواء کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ پشتونوں نے بھی سلامتی اداروں پر ماورائے عدالت قتل، گمشدگیوں اور دیگر انسانی حقوق خلاف ورزیوں کا الزام عائد کیا۔

اُنیتس مئی کو کوئٹہ کے ہزارہ ٹاؤن میں ہجوم نے ایک پشتون نوجوان کو قتل اور دو دیگر کو سخت زخمی کر دیا۔ حملہ کے حوالہ سے مختلف اطلاعات تھیں۔ کسی نے کہا کہ پشتون نوجوان ہزارہ لوگوں کی خواتین کو تنگ کر رہے تھے جبکہ دیگر نے اس کو لین دین کا معاملہ قرار دیا۔ حکام نے بارہ افراد کو حملہ میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کیا۔

دوسری جانبفرقہ وارانہ عسکری گروہوں نے کوئٹہ بلوچستان میں اقلیتی شیعہ ہزارہ برادری پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہزارہ برادری کو امتیازی سلوک اور تشدد کے خطرات کا سامنا بھی رہا۔ پریس اور دیگر ذرائع کے مطابق ہزارہ نسل کے افراد کوئٹہ میں اپنے دو علاقوں سے باہر نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ برادری کے رہنماؤں نے شکایت کی کہ اضافی سیکیورٹی اقدامات نے اُن کے علاقوں کو پناہ گزین بستیوں میں تبدیل کر دیا ہے، جس کے نتیجہ میں اُن کا معاشی استحصال ہو رہا ہے۔ روزمرہ کی اشیاء ہزارہ علاقوں میں مہنگے داموں پر دستیاب ہوتی ہیں اور ہزارہ برادری نے تلاش روزگار اور حصول اعلیٰ تعلیم کی کوششوں میں مشکلات کی شکایت کی۔

پچیس مارچ کو بلوچستان کے چیف سیکریٹری نے اعلان کیا کہ مذکورہ دو علاقوں ہزارہ ٹاؤن اور مری آباد کو کرونا وائرس وبا کے باعث سیل کیا جائے گا کیونکہ وہاں کے رہائشیوں میں بڑے پیمانہ پر وائرس پایا جا رہا ہے۔ اس وقت ہزارہ سرکاری ملازمین کے کووڈ ٹیسٹ مثبت آئے تھے تو چیف سیکریٹری نے اُن کے بارے میں مزید کہا کہ ہزارہ قبیلہ سے تعلق رکھنے والے بلوچستان حکومت کے عملہ میں یہ وائرس زیادہ ہے، بعد ازاں سوشل میڈیا پر لوگوں نے شیعہ وائرس کے ٹرینڈ چلائے اور ایران سے ہجرت کرنے والے ہزارہ برادری افراد پر وائرس پاکستان میں متعارف کروانے کا الزام لگایا۔ برادری کے ارکان نے حکام پر شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے اجراء میں تعصب پرستی کا الزام بھی لگایا۔ حکام نے شیعہ مذہبی جلوسوں کو اضافی سیکیورٹی فراہم کی لیکن اُن کی عوامی سرگرمیوں کو ہزارہ علاقوں تک ہی محدود رکھا گیا۔

جنسی اور صنفی بنیادوں پر روا پُر تشدد واقعات، مجرمانہ اقدامات اور بدسلوکی کے دیگر ہتھکنڈے

باہمی رضامندی سے ہم جنس پرستی مجرمانہ فعل ہے۔ہم جنس پرست تعلقات کی مجوزہ سزا میں جرمانہ، دوسال سے عمر قید تک جیل یا پھر دونوں سزائیں شامل ہیں۔ہم جنس پرست خواتین، ہم جنس پرست مرد، ہیجڑے، خواجہ سرا، مذکر و مؤنث دونوں خصوصیات کے حامل افراد [ایل جی بی ٹی آئی] نے کبھی کبھار ہی اپنی جنسی شناخت یا رجحان کو افشاء کیا۔ خواجہ سرا خواتین کی باقاعدہ سرگرم برادری موجود تھی مگر وہ بھی سماجی طور پر الگ تھلگ تھی اور تشدد اور بارہا چھیڑ خانی کا شکار پائی گئی۔

ایل جی بی ٹی آئی افراد کے خلاف تشدد اور امتیازی سلوک کا سلسلہ جاری رہا۔اس طرح کے جرائم کا اکثر پتہ تک نہیں چلتا جبکہ پولیس بھی اطلاع ملنے کے بعد بہت کم کارروائی کرتی ہے۔

سنہ ۲۰۱۹ء میں آئی جی پولیس نے اعلان کیا کہ حکومت سندھ پولیس میں ملازمتوں کا صفر اعشاریہ پانچ فیصد کوٹہ خواجہ سراؤں کے لیے مختص کرے گی۔ مئی میں راولپنڈی پولیس نے خواجہ سراء افراد کے تحفظ کا آزمائشی منصوبہ شروع کیا۔ تحفظ مرکز کے عنوان سے منصوبہ کا آغاز بارہ مئی کو ہوا اور اس میں پہلی بار خواجہ سراء فرد کو بطور معاون افسر اور ایک خواجہ سراء برادری کا نمائندہ بھی تعینات کیا گیا۔

جولائی میں آن لائن شیئر ہونے والی ایک وڈیو میں نظر آتا ہے کہ راولپنڈی میں کچھ لوگ خواتین خواجہ سراؤں کو بندوق کے زور پر یرغمال بنا کر لوٹ مار اور جنسی درندگی کا نشانہ بناتے ہیں۔

ایک این جی او کے مطابق خیبر پختونخوا میں جیل حکام خواجہ سراؤں کو علیحدہ حوالات میں رکھتے ہیں اور صوبائی حکومت نے حوالات میں اصلاحات کے لیے نگراں کمیٹی بھی تشکیل دی ہے۔ خیبر پختونخوا کے تھانوں میں خواجہ سراؤں کے لیے علیحدہ ڈیسک قائم اور پولیس کے تربیتی نصاب میں خواجہ سرا افراد کے حقوق کے بارے میں تعلیم شامل کی گئی ہے۔اسلام آباد وفاقی علاقہ اور پنجاب میں کام کرنے والی مقامی غیر سرکاری تنظیموں نے پولیس افسران کو خواجہ سراء برادری کے حقوق کی آگہی کی تربیت کا انعقاد بھی کیا۔

ایل جی بی ٹی آئی کے حقوق پر کام کرنے والی متعدد غیر سرکاری تنظیموں اور کارکنوں کے مطابق، معاشرے نے خواجہ سرا خواتین، مخنث اور انٹر سیکس افراد سے لاتعلقی اختیار کی ہوئی ہے، جو کہ اکثر کچی آبادیوں میں رہائش پذیر ہوتے ہیں اور بھیک مانگ کر یا پھر میلوں اور شادیوں میں رقص کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جسم فروشی کا دھندہ بھی کرتے ہیں۔ مقامی حکام نے اکثر خواجہ سراؤں کا موروثی ملکیت پر حق تسلیم کرنے اور ان کو اسکول یا اسپتال میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کیا جبکہ مکان مالکان بھی اس کمیونٹی کو گھر فروخت کرنے یا کرائے پر دینے سے کتراتے ہیں۔

سنہ ۲۰۱۸ء میں پاس ہونے والا خواجہ سرا افراد کے تحفظ کا تاریخی قانون اُن میں سے بے شمار مشکلات کو حل کرنے میں مددگار بن سکتا ہے۔ مذکورہ قانون خواجہ سرا افراد کو اپنی "تصور کردہ جنس" کے طور پر شناخت اختیار کرنے، بنیادی حقوق کی ضمانت اور ہراسگی سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور ملازمت، رہائش، تعلیم، صحت کی دیکھ بھال اور دیگر سہولیات میں ان کے خلاف امتیازی سلوک کو غیر

قانونی قرار دیتا ہے۔ تاہم ہم جنس پرست افراد کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں کسی بھی قسم کا قانون موجود نہیں ہے۔ سپریم کورٹ کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں ایک فیصلے میں خواجہ سرا افراد کو "تیسری جنس" کے طور پر تسلیم کر کے ان کو قومی شناختی کارڈ حاصل کرنے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ قومی شناختی کارڈ ووٹ کے اندراج کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا خواجہ سرا افراد کو انتخابات میں بطور امیدوار اور ووٹر شرکت کا بھی موقع میسر ہوا ہے۔

ایچ آئی وی اور ایڈز کے متعلق معاشرتی حقارت

ملک میں ایچ آئی وی ایڈز کی بیماری منشیات کے عادی افراد میں صفر اعشاریہ ایک فیصد آبادی میں پائی جاتی ہے۔ یہ بیماری مخصوص آبادیوں خاص طور پر ٹیکے کے ذریعہ سے نشہ کرنے والے افراد (۲۱ فیصد) میں عام ہے۔ عام لوگوں اور حفظان صحت کے ذمہ دار عملے کی جانب سے حقارت اور امتیازی سلوک اس مرض میں مبتلا افراد کی علاج تک رسائی میں بڑی رکاوٹ بنا رہا۔ ایچ آئی وی کے بارے میں اقوام متحدہ کے مشترکہ پروگرام کے مطابق ایچ آئی وی میں مبتلا ۱۴ فیصد افراد کو اپنی بیماری کے بارے میں معلوم ہے اور ہر دس میں سے ایک انسداد وائرس علاج کروا رہا تھا۔ خواجہ سرا افراد کے حقوق پر

کام کرنے والی تنظیموں اور کارکنوں کے مطابق ایچ آئی وی ان کی برادری میں زیادہ پائی جاتی ہے اور طبّی امداد بھی بالکل کم میسر ہوتی ہے۔

دیگر نوعیت کا سماجی تشدد اور امتیازی سلوک

مذہبی عدم برداشت کے باعث سماجی تشدد ایک گھمبیر مسئلہ بنا رہا۔ عیسائی، احمدی اور ہندو مذہبی اقلیتوں کے خلاف گاہے بگاہے بلوہ کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ شیعہ مسلمان کارکنوں نے ملک کے محدود علاقوں میں ٹارگٹ کلنگ اور جبری گمشدگیوں کی اطلاعات دیں۔

خواتین کے حقوق کے کارکنان نے مذہبی گروہوں کی جانب سے دھمکیوں اور تشدد کا سامنا کیا۔ ۲۵ فروری کو جمیعت علمائے اسلام فضل (جی یو آئی ایف) نے سکھر میں آٹھ مارچ کو منعقد ہونے والے عورت آزادی مارچ میں خلل ڈالنے کی دھمکی دی اور کہا کہ عورت مارچ فحاشی کو فروغ دیتا ہے اور اسلامی اقدار سے متصادم ہے۔ مارچ سخت سیکیورٹی میں منعقد کیا گیا لیکن متعدد این جی اوز نے براہ راست دھمکیوں کے باعث شرکت نہیں کی۔ اسلام آباد میں عورت مارچ پر مردوں کی جانب سے اینٹوں اور پتھروں سے حملہ میں متعدد افراد زخمی ہوئے۔

حصہ ہفتم۔ محنت کشوں کے حقوق

الف) انجمن سازی کی آزادی اور اجتماعی سوداکاری کا حق

افرادی قوت کی اکثریت صوبائی لیبر قوانین کے تابع تھی۔ ۲۰۱۰ء کی اٹھارویں آئینی ترمیم نے محنت کشوں کے بارے میں قانون سازی اور پالیسی کے اختیارات چاروں صوبوں کو منتقل کیے، لیکن ساتھ یہ بھی صادر کیا کہ موجودہ قوانین اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے جب تک صوبائی حکومت ان کو تبدیل، ختم یا ترمیم نہیں کرتی۔

سنہ ۲۰۱۱ء میں صوبوں نے اپنے مقامی صنعتی تعلقات کے قوانین بھی نافذ کیے۔ ۲۰۱۲ء میں پارلیمینٹ نے صنعتی تعلقات کا نیا ایکٹ پاس کیا، جس میں بین الاقوامی ادارہ برائے محنت کش افراد (آئی ایل او) کے قوانین کو بھی شامل کیا گیا مگر ان کو فقط وفاقی دارالحکومت اسلام آباد اور ان تجارتی انجمنوں پر نافذ العمل قرار دیا گیا جو کہ ایک سے زیادہ صوبوں میں فعال ہیں۔

اختیارات کی نچلی سطح تک منتقلی کے بعد وفاقی حکومت کا کردار غیر واضح رہا۔ محنت کش افراد کے امور کے بارے میں کچھ حد تک بااختیار وفاقی ادارہ وزارتِ برائے سمندر پار پاکستانی و ترقی انسانی وسائل تھا، جس کا مقامی لیبر کی نگرانی میں کردار آئی ایل او ضوابط پر عملدرآمد دکھانے کی غرض سے اعداد و شمار جمع کرنے تک محدود تھا۔ صوبائی سطح پر اجتماعی سودے کاری کے حقوق یقینی بنانے والے قوانین کی عملداری میں بینکاری اور مالیاتی شعبہ، جنگلات، طبّی عملہ، اپنا کاروبار کرنے والے کسان اور انتظامی عہدوں پر تعینات افراد شامل نہیں تھے۔

قومی سطح پر مزدوروں کے امور کے ذمہ دار وفاقی ادارے کی غیر موجودگی میں، قومی کمیشن برائے صنعتی تعلقات کا ناحال وجود میں رہنا ایک سوالیہ نشان ہے۔

وفاقی صنعتی تعلقات ایکٹ ۲۰۱۲ء بیان کرتا ہے کہ یہ کمیشن وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کی حدود میں ان صنعتی تنازعات کا فیصلہ کرے گا جن میں ٹریڈ یونین یا ٹریڈ یونین کی فیڈریشن فریق ہے اور یہ کمیشن حکومت کی جانب سے تعین کیے گئے قومی اہمیت کے دیگر کسی تنازعہ کو حل کرنے کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ لیکن یہ قانونی شق بین الصوبائی تنازعات کے حوالہ سے خصوصی فورم فراہم نہیں کرتی ہے

مگر بظاہر اس امکان کو اظہار کرتی ہے کہ کمیشن اس نوعیت کے تنازعات حل کر سکتی ہے۔ محنت کشوں کے حقوق کی تنظیموں نے لیبر ریلیشنز قوانین کو صوبائی سطح پر نافذ کرنے میں اہلیت اور مالی وسائل کی عدم دستیابی کے مسائل کی نشاندہی کی۔

قانون ریاستی عہدیداروں، سرکاری تجارتی اداروں اور ایکسپورٹ پراسیسنگ زونز یا سرکاری شعبے کے کارکنوں کو اجتماعی سودے کاری یا ہڑتال کرنے سے منع کرتا ہے۔ البتہ نجکاری کے منتظر سرکاری تجارتی اداروں میں مسلسل مزدوروں کی ہڑتالوں کا سلسلہ جاری رہا۔ صوبائی انڈسٹریل ریلیشنز قوانین بھی ہڑتال اور تالابندی کا تصفیہ اور اُن کو محدود کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خیبر پختونخوا کا ایکٹ بیان کرتا ہے کہ "اگر ہڑتال یا تالابندی تیس دن سے زیادہ عرصہ تک برقرار رہتی ہے تو، حکومت تحریری حکم نامے کے تحت ہڑتال یا تالابندی پر پابندی نافذ کر سکتی ہے" اور بعد ازاں لازمی طور پر تنازعہ کو لیبر کورٹ میں لے جائے گی۔

حکومت نے متعلقہ قوانین کو موثر طریقہ سے نافذ نہیں کیا اور شہری حقوق کے انکار جیسا کہ امتیازی سلوک کی نسبت سزائیں نہایت ہی کم نوعیت کی تھیں۔

وفاقی قانون غیر قانونی ہڑتالوں، دھرنا بازی اور دیگر اقسام کے احتجاج کو "سول بدامنی" کے باعث جرم ٹھہراتا ہے، جس کی سزا عمر قید تک ہے۔ یہ قانون بیان کرتا ہے کہ چار یا اس سے زائد افراد کے اجتماع کے لیے پولیس کی اجازت لازمی ہے، اس شق کو حکام ٹریڈ یونین کے اجتماعات کے خلاف استعمال کرنے کے مجاز ہیں۔ تاہم اس کے باوجود یونین تنظیمیں بڑے پیمانے پر احتجاجی دھرنے منعقد کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں لیکن پولیس نے ان ہڑتالوں کو ناکام بنایا اور آجروں نے ان اقدامات کو ملازمین کی برطرفی کے لیئے بطور عذر استعمال کیا۔ چھ اپریل کو بلوچستان پولیس نے کرونا وبا کے دوران اسپتالوں میں ذاتی تحفظ کے سامان کی عدم دستیابی کے خلاف احتجاج کرنے والے افراد کے خلاف طاقت کا استعمال کیا اور کوئٹہ میں ایک درجن سے زیادہ مظاہرین کو گرفتار کیا۔ پولیس کی جانب سے بعض اوقات یونین عہدیداروں کی گرفتاریوں کے باوجود مارچ اور دھرنے سال بھر جاری رہے۔

سیاسی منشااور وسائل کی قلت کے باعث لیبر قوانین کا نفاذ بڑے پیمانے پر کمزور رہا۔ زیادہ تر تنظیمیں حکومت یا کسی بھی سیاسی پارٹیوں کے اثر سے آزاد ہو کر کام کرتی رہیں۔ مزدور رہنماؤں نے مؤثر یونین سازی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی غرض سے مالکان کی مالی اعانت سے قائم کردہ "انتظامیہ۔ دوست "اور کاغذی ورکر یونین یا نام نہاد زرد انجمنوں کی موجودگی پر تحفظات کا اظہار کیا۔

حکومت کی جانب سے جائز طریقہ ہائے کار کے بغیر کسی یونین کو تحلیل کرنے کی کوئی رپورٹ نہیں موصول ہوئی۔ تاہم اس کے باوجود انتظامی طور پر یونین کی رجسٹریشن عدالتی جائزے کے حق کے بغیر رد کی جاسکتی تھی۔

مزدوروں کے حقوق کے لیے سرگرم غیر سرکاری تنظیموں نے محنت کشوں کی مدد کرتے ہوئے ان کو فنی تربیت اور صلاحیتوں کو بہتر بنانے کی تربیتی نشستیں منعقد کیں جس کا مقصد لیبر یونینز اور ٹریڈ تنظیموں کو مضبوط کرنا تھا۔

انہوں نے پہلے سے قائم لیبر یونینز کے ساتھ مل کر غیر رسمی شعبے میں کام کرنے والے مزدوروں کو متحد کرنے اور مزدوروں کے حقوق کے لیے کام کرنے کے حالات اور خوشحالی کو یقینی بنانے کے لیے پالیسیوں اور قانون سازی کے لیے سرگرمی کی۔ این جی او زنے صوبائی حکومتوں کے ساتھ مل کر زرعی کارکنوں، بھٹہ مزدوروں اور خطرات سے دوچار دیگر محنت کشوں کو قومی شناختی کارڈ کی فراہمی پر کام کیا تاکہ ان کو بھی ملک کے سماجی تحفظ کے نظام میں لایا جاسکے اور ووٹ، صحت اور تعلیم کی سہولیات سمیت شہری حقوق تک رسائی دی جاسکے۔ حکومت نے کووڈ۔۱۹ وبا سے متاثرہ افراد کے لیے شجرکاری مہم کے ذریعہ ساٹھ ہزار ملازمتیں تخلیق کرنے کا اعلان کیا۔

ب) جبری مشقت یا بیگار کی ممانعت

قانون ہر قسم کی جبری مشقت اور بیگار سے ممانعت، اور بیگار کیمپ کا قرضہ منسوخ کرتا ہے اور اس کی وصولی کے لیے قانونی چارہ جوئی پر بھی پابندی عائد کرتا ہے، جبکہ اس قانون کے نفاذ کے لیے ضلعی "نگراں کمیٹی" قائم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ تاہم آئی ایل او نے خدشات کا اظہار کیا کہ بعض ضروری خدمات کے شعبہ میں ملازمت کرنے والے افراد سے متعلق قوانین ملازمین کو آجر سے اجازت لیے بغیر

ملازمت چھوڑنے سے منع کرتے ہیں، کیوں کہ ملازمت چھوڑنے کی وجہ پر آجر کی جوابی قانونی کارروائی کی صورت میں ان مزدوروں کو قید بامشقت سمیت سزا ملنے کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

قانون طاقت، دھوکہ دہی یا مکاری کے ذریعہ کسی بھی شخص کو جبری مشقت یا جنسی کاروبار میں استعمال کی خاطر بھرتی، تیار، منتقل یا کسی دوسرے شخص کو اس مقصد سے حاصل کرنے (یا ایسا کرنے کی کوشش) کی تشریح بردہ فروشی یا ٹریفکنگ اِن پرسنز کے طور پر کرتا ہے۔ بردہ فروشی کی سزا اُس جرم کے خاتمہ کے لیے کافی ہے۔ تاہم عصمت فروشی کے لیے منتقلی کے جرم میں قید کے بجائے جرمانہ کی ادائیگی کی اجازت عصمت دری سمیت دیگر اس نوعیت کے سنگین جرائم کی انسداد کے لیے مقرر سزاؤں سے موافق نہیں ہیں۔ سیاسی عزم کی کمی، حکام کی مبینہ طور پر انسانی اسمگلنگ میں ملوث ہونے، قانون میں تکنیکی خامیوں، وفاقی اور مقامی حکومتوں میں انتظامی تبدیلیوں اور مالی وسائل کی عدم دستیابی کی وجوہات جبری مشقت سے متعلقہ وفاقی قوانین نافذ کرنے میں حکام کی ناکامی کا باعث بنیں رہیں۔ وسائل، معائنہ اور ازالہ کی انتظامات بالکل ناکافی تھے۔

ملک کی متعدد صنعتوں میں جبری مشقت اور بیگار کا عمل وسیع طور پر پایا جاتا ہے۔ این جی اوز کے اندازے کے مطابق ۲۰ لاکھ کے قریب افراد بیگار کا شکار تھے، جن میں سے زیادہ تر سندھ اور پنجاب میں تھے، لیکن بلوچستان اور کے پی میں بھی ایسے افراد موجود تھے۔ بیگار میں کام کرنے والوں میں زیادہ تر نچلی ذات کے ہندو اور عیسائی، جبکہ پسماندہ سماجی و معاشی پس منظر کے مسلمان شامل تھے۔ جبری مشقت شعبہ زراعت، بشمول کپاس، گنے اور گندم کی صنعتوں اور اس کے علاوہ اینٹوں، کوئلے اور قالین سازی کی صنعتوں میں بھی پائی جاتی تھی۔ بیگار میں کام کرنے والے محنت کش عام طور پر یہ تخمینہ لگانے سے قاصر تھے کہ ان کی جانب واجب الادا قرض مکمل طور پر ادا ہو چکے ہیں یا نہیں، جس کی بڑی وجہ معاہدے کی عدم موجودگی، یا پھر مالکان کی جانب سے مزدوروں کی ناخواندگی کا فائدہ اٹھا کر قرضوں کی رقم یا بیج اور کھاد کی قیمتوں میں ردوبدل کرنا تھا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوا کہ زمینداروں نے مسلح محافظ مقرر کر کے مزدوروں کی نقل و حرکت پر بندش لگا دی یا ان کی طرف واجب الادا قرض کے عوض دوسرے آجروں کو فرخت کر دیا۔

زمینداروں، صنعتکاروں اور بااثر سیاستدانوں کے آپس میں تعلقات کی وجہ سے مسائل کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوششوں کو دھچکا پہنچا۔ مثال کے طور پر کچھ مقامی پولیس والوں نے زمین یا بھٹہ مالکان کے خلاف یہ سوچ کر مؤثر کارروائی کرنے سے گریز کیا کہ ان کے افسران بالا شاید سیاست دانوں یا مالکان کے اپنے دباؤ سے متاثر ہو کر قانونی تفتیش کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں گے۔ جبری بیگار سے

آزاد ہونے والے بعض مزدوروں کو دوسرے مقامات پر متبادل روزگار کے مواقع میسر نہ ہونے کی وجہ سے اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا پڑا۔ سندھ میں انسداد بیگار ایکٹ مجریہ ۲۰۱۵ء کے ساتھ امدادی دیوانی طریقہ ہائے کار کی عدم موجودگی کے باعث اس کا نفاذ نہیں ہو سکا۔ جولائی تک دستیاب معلومات کے مطابق بیگار کی نگرانی کے لیے قائم ۲۹ نگراں کمیٹیوں میں سے صرف گیارہ نے اجلاس منعقد کیے لیکن کورم کی کمی اور غیر سرکاری تنظیموں اور سرکاری اداروں کی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے وہ غیر فعال رہیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو غیر قانونی بھکاری گروہوں، گھریلو ملازمت یا زراعت کے شعبہ میں جبری مشقت کے لیے استعمال کرنے کی غرض سے خرید و فروخت، اغوا یا کرائے پر حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رہا (ملاحظہ کریں سیکشن ہفتم ج)۔ غیر قانونی ایجنٹوں نے بہتر ملازمت کے جھانسے دے کر بچوں کے والدین سے پیسے بٹورنے کے بعد بچوں کا استحصال کرتے ہوئے ان سے گھریلو ملازمت، غیر ہنر مند لیبر اور چھوٹی دکانوں اور دیگر شعبوں میں جبری مشقت کروائی۔

حکومت پنجاب نے بچوں سے مشقت اور جبری مشقت کی انسداد کے منصوبہ کی مالی اعانت جاری رکھی، جس کے تحت محکمہ لیبر پنجاب نے اینٹوں کے بھٹوں میں بچوں سے مزدوری کرانے کے سدباب اور جبری مشقت سے نمٹنے پر کام کیا۔ انہوں نے ورکرز کو قومی شناختی کارڈ، سود سے پاک قرض اور بھٹوں کے آس پاس اسکول کی فراہمی میں مزدوروں کی مدد کی۔ ۲۹ مارچ کو لاہور ہائی کورٹ نے متعقلہ سیکریٹری کو حکم دیا کہ بھٹوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی فیس ادا کرنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔ یکم جولائی کو حکومتِ پنجاب نے بھٹہ مزدوروں کی تنخواہوں کے تعین، اوور ٹائم کام کی شرائط اور تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔ خیبر پختونخوا، پنجاب اور سندھ کی لیبر وزارتوں نے اینٹوں کے بھٹوں اور ان میں کام کرنے والے کارکنوں کے اندراج پر کام کیا تاکہ اس صنعت کو مؤثر انداز میں چلایا جا سکے اور مزوروں کی لیبر کورٹ اور دیگر سہولیات تک رسائی ممکن بنائی جا سکے۔ خیبر پختونخوا میں دس مزدوروں سے کم ملازمین والے بھٹے کارخانہ قرار نہیں دیے جاتے اس لیے بھٹہ خشت مالکان نے دس سے کم ملازمین رکھنے کو ترجیح دی۔

اس ضمن میں محکمہ خارجہ کی ٹریفکنگ اِن پرسنس رپورٹ بھی مندرجہ ذیل ویب لنک پر ملاحظہ کریں

https://www.state.gov/trafficking-in-persons-report

اور بچوں سے مشقت کے بدترین طریقوں کے بارے میں محکمہ خارجہ کی رپورٹ بھی نیچے دیے گئے لنک پر دستیاب ہے

https://www.dol.gov/agencies/ilab/resources/reports/child-labor/findings

ج)بچوں سے مشقت کی ممانعت اور ملازمت کے لیے کم از کم عمر

ملکی قانون بچوں سے بدترین مشقت لینے کے ساری نوعیتوں پر پابندی عائد نہیں کرتا۔وفاقی حکومت نے بچوں سے گھریلو مشقت اور دیگر خطرناک مزدوری لینے کے عمل پر بچوں سے ملازمت سے متعلق ۱۹۹۱ء کے قانون میں ۳۰جولائی کو ترمیم کرکے پابندی لگادی۔ اس قانون کا اطلاق اسلام آباد وفاقی علاقہ میں ہوگا لیکن صوبوں کو اس کو اختیار کرنے کے لیے ترمیم کرنے پڑے گی۔اکتوبر ۱۹ تک موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق کسی بھی صوبہ نے قانون منظور نہیں کیا تھا۔آئین ۱۴ برس سے کم عمر بچوں کی کارخانے، کان اور دیگر خطرناک مقامات پر ملازمت پر سختی سے پابندی عائد کرتا ہے۔بچوں کی ملازمت کے بارے میں قومی قانون خطرناک مقامات پر کام کے لیے کم سے کم عمر ۱۴سال مقرر کرتا ہے،جو بھی بین الاقوامی قوانین کے مطابق نہیں ہے۔ خیبر پختونخوا،سندھ اور پنجاب میں صوبائی قوانین بین الاقوامی معیار کے موافق خطرناک مقامات پر کام کی کم از کم عمر اٹھارہ سال مقرر کرتے ہیں۔ستمبر میں بلوچستان میں بچوں کی ملازمت کے نظم ونسق کا بل ۲۰۲۰ء پاس کرکے خطرناک مقامات پر ملازمت کی عمر ۱۴اور کوئلہ کی کان میں کام کی عمر ۱۵ سال تک مقرر کی گئی۔مئی میں حکومت پنجاب نے پنجاب ڈومیسٹک ورکرز ایکٹ مجریہ ۲۰۱۹ء کا اعلان کیا تھا،جس میں ۱۵سال سے کم عمر کے بچہ کو بطور گھریلو ملازم بھرتی کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔پابندیوں کے باوجود ملک بھر سے بچوں کے بارے میں اطلاعات تھیں کہ وہ قانون میں خطرناک قرار دیئے گئے مقامات جیسا کہ چمڑے کی صنعت،خشت سازی اور گہرے سمندر میں ماہی گیری کے شعبوں میں کام کررہے ہیں۔

قانون دکانوں اور دیگر غیر خطرناک مقامات پر کام کی عمر ۱۴ سال جبکہ فیکٹریوں اور خطرناک مقامات پر ملازمت کے لیے کم سے کم عمر پندرہ سال مقرر کرتا ہے لیکن اس پابندی کا غیر رسمی شعبوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ قانونی طور پر ملازمت کرنے والے بچوں کے لیے قانون کام کے اوقات کار سات گھنٹے مقرر کرتا ہے، جس میں ہر تین گھنٹے کی محنت کے بعد ایک گھنٹہ آرام بھی شامل ہے جبکہ یہ قانون کام کے لیے وقت تعین اور چھٹی کی سہولت بھی فراہم کرتا ہے۔ قانون بچوں کے اوور ٹائم یا رات کے وقت کام کرنے سے ممانعت کرتا ہے اور یہ حکم بھی صادر کرتا ہے کہ ان کو ہفتے میں ایک چھٹی ملنی چاہئے۔ اس کے ساتھ قانون آجروں کو پابند کرتا ہے کہ وہ لیبر انسپکٹر کی جانب سے تصدیق کو یقینی بنانے کے لیے کمسن مزدوروں کے اندراج کا رجسٹر ساتھ رکھیں۔ یہ قومی پابندیاں اور قواعد وضوابط گھریلو کاروبار پر لاگو نہیں ہوتیں۔

وفاقی قانون اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کے استحصال کی ممانعت کرتا ہے، اور جسمانی کھیل، جنسی حرکات اور دیگر بدسلوکی والی سرگرمیوں کو استحصالی تفریح قرار دیتا ہے۔ بچوں کا استحصال کرنے والے والدین قانون کو جوابدہ ہیں۔

بچوں سے مشقت لینے کا سلسلہ جوں کا توں جاری رہا اور متعدد بچے زراعت اور گھریلو ملازمت سے وابستہ رہے۔ ایسی بھی اطلاعات تھیں کہ چھوٹی ورکشاپوں میں زیادہ کمسن مزدور ملازمت کر رہے ہیں، جس کے باعث انسداد چائلڈ لیبر قوانین نافذ کرنے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ غریب دیہاتی خاندانوں نے بعض اوقات اپنے بچوں کو گھریلو ملازمت یا دیگر اقسام کے کام کے لیے فروخت کیا یا ایجنٹوں کو ایسے کسی کام کا انتظام کرنے کے لیے معاوضہ دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے بچے اچھے ماحول میں کام کریں گے۔ تعلیم فراہم کرنے یا دیگر مراعات کے بدلے جان پہچان والوں کے ہاں کام کرنے کے لیے بھیجے گئے بچے بھی استحصالی حالات اور جبری مشقت کا شکار ہوئے۔ منظم بھکاری ٹولوں، گھریلو ملازمت، عسکری اور جرائم پیشہ ٹولوں، اور جنسی فحاشی کی غرض سے اسمگلنگ کے جرائم میں استعمال ہونے کے لیے بچوں کے اغوا یا خرید وفروخت کے واقعات رونما ہوئے۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق کرونا وائرس وبا کے باعث مزید بچے اسکولوں سے نکل کر مزدوری کی جانب راغب ہو رہے تھے تاکہ وبا کی وجہ سے غربت کا شکار ہونے والے والدین کا ہاتھ بٹا سکیں۔ این جی او اسپارک کے دعویٰ کے مطابق ایک کروڑ بیس لاکھ بچے جبری مشقت کا شکار تھے۔

بچوں سے مشقت کے مسائل کے خلاف وفاقی سطح کی کارروائیاں بے اثر رہیں۔اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی کے نتیجہ میں مزدوروں کا معائنہ وفاق کے بجائے صوبائی سطح پر کیا گیا، جس کے باعث لیبر قانون کے غیر متوازن استعمال میں اضافہ ہوا۔ قانون نافذ کرنے کی طاقت مسئلہ کے حجم کے مقابلے میں کم رہی۔انسپکٹروں کے پاس تربیت اور وسائل کی کمی تھی اور ان پر بدعنوانی میں ملوث ہونے کا شک کیا جاسکتا تھا۔بچوں سے مشقت کے قانون کی خلاف ورزی پر حکام نے سینکڑوں شکایتیں درج کیں لیکن قانون کی پامالی کے مرتکب افراد پر لاگو کیا جانے والا جرمانہ مستقبل میں ان کو اس جرم سے باز رکھنے کے اعتبار سے بالکل کم تھا۔حکام نے این جی اوز کو آزادانہ طور پر معائنہ کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ محکمہ لیبر کی بچوں سے مشقت کی سنگین نوعیتوں کے بارے میں رپورٹ مندرجہ ذیل لنک پر ملاحضہ کریں

https://www.dol.gov/agencies/ilab/resources/reports/child-labor/findings

اور بچوں کی محنت اور جبری بیگار کے ذریعہ تیار کی جانے والی مصنوعات کی محکمہ خارجہ کی تیار کردہ فہرست مندرجہ ذیل لنک پر دستیاب ہے

https://www.dol.gov/agencies/ilab/reports/child-labor/list-of-goods.

د) ملازمت اور پیشہ کے حوالہ سے امتیازی سلوک

اگرچہ قواعد وضوابط ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں میں نسل، جنس، معذوری، زبان، صنفی شناخت، ایچ آئی وی یا دیگر وبائی بیماری یا سماجی حیثیت کی بنیاد پر امتیازی سلوک کرنے سے روکتے ہیں تاہم حکومت نے ان قوانین کو مؤثر انداز میں نافذ نہیں کیا۔مذکورہ حقائق کی بنیاد پر ملازمت اور پیشہ ورانہ ماحول میں تفریق چھائی رہی۔خواتین مجموعی آبادی کا پچاس فیصد ہونے کے باوجود افرادی قوت میں اُن کی تعداد صرف ۲۴ فیصد ہے۔۲۰۱۲ء کا ایکٹ برائے قیام خصوصی اقتصادی زون میں تحفظ کے امور کو بہت ہی کم توجہ دی گئی جبکہ لیبر

کے حقوق، امتیازی سلوک کے خاتمے اور ہراسگی کی انسداد سے متعلق قومی قوانین مبہم ہی رہے۔ مذکورہ خلاف ورزیوں کی سزائیں دیگر شہری حقوق جیسا کہ انتخابات میں مداخلت جیسے اقدامات کی نسبت بہت ہی کم ہیں۔

ہ) کام کرنے کے لیے سازگار حالات

سنہ ۲۰۱۰ء میں اٹھارویں آئینی ترمیم کی منظوری کے بعد وفاقی وزارت برائے محنت اور افرادی قوت تحلیل کر کے محنت کشوں کے امور صوبوں کے حوالے کیے گئے۔ مزدوروں کی نمائندہ تنظیموں، بین الاقوامی اداروں اور این جی اوز نے انتقال اختیار پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ کم از کم اجرت، مزدوروں کے حقوق، قومی لیبر معیار کے تعین اور بین الاقوامی لیبر قوانین پر عملدرآمد کی نگرانی سمیت محنت کشوں کے امور وفاقی حکومت کے دائرہ اختیار میں رہنے چاہئیں۔ مبصرین نے صوبوں کی صلاحیتوں اور عزم پر بھی تحفظات کا اظہار کیا کہ وہ کیسے لیبر قوانین کو اپنا کر عملدرآمد کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس، کچھ بین الاقوامی تنظیموں نے یہ بھی کہا کہ اختیارات کی منتقلی سے کچھ صوبوں میں صوبائی اداروں کی کارکردگی، خاص طور پر معائنہ کی صلاحیت، میں بہتری پائی گئی۔

حکومت کی جانب سے تعین کردہ کم از کم اُجرت غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والے افراد کے بارے میں اُس کی تشریح سے زیادہ ہے، جو کہ ۹،۳۰۰ پاکستانی روپے یعنی ۶۰ ڈالر ماہانہ ہے۔ جبکہ کم از کم تنخواہ ساڑھے سترہ ہزار یعنی ایک سو چھ ڈالر ماہانہ ہے۔ یہ کم سے کم تنخواہ عالمی بینک کی جانب سے لگائے گئے غربت کے خاتمہ کے لیے درکار تنخواہ سے بھی زیادہ تھی۔ حکام نے ۲۰۱۹ء کے سالانہ بجٹ میں کم از کم اجرت میں اضافہ کیا جبکہ وفاقی اور صوبائی دونوں حکومتوں نے اس اضافہ پر فوری عمل درآمد کے نوٹیفکیشن جاری کیئے۔ بہر حال، کم از کم اجرت کے قانون کا نفاذ محنت کشوں کے اہم شعبوں، بشمول غیر روایتی شعبے، گھریلو ملازمین اور شعبہ زراعت سے وابستہ مزدوروں پر نہیں ہوتا جبکہ کم از کم تنخواہ کے قوانین کا نفاذ بھی غیر متوازن تھا۔

قانون زیادہ سے زیادہ ۴۸ گھنٹہ فی ہفتہ (موسمی کارخانوں کے لیے ۵۴ گھنٹے) کام کرنے کی حد کا تعین کرتا ہے۔ جس میں کام کے دوران آرام کا وقفہ اور تنخواہ کے ساتھ سالانہ چھٹیاں شامل ہیں۔ لیبر کوڈ کے تحت اضافی مراعات میں سرکاری چھٹیاں، اوورٹائم، سالانہ اور بیماری کی صورت میں چھٹی، صحت کی دیکھ بھال، مزدوروں کے بچوں کے لیے تعلیم، اولڈ ایج مراعات اور ورکرز ویلفیئر فنڈ کی مراعات شامل ہیں۔ لیکن بہت سے مزدور کانٹریکٹ لیبر کے طور پر بھرتی کیے گئے تھے، جن کو بنیادی اجرت کے سوا کوئی بھی مراعات یا ملازمت کا تحفظ حاصل نہیں تھا اگرچہ وہ کئی سالوں سے ایک ہی آجر کے پاس کام کرتے چلے آرہے ہوں۔ یہ قوانین شعبہ زراعت کے محنت کشوں، دس سے کم ملازمین والے کارخانوں، گھریلو ملازمین پر لاگو نہیں ہوتے۔ ان اقسام کی ملازمتوں سے وابستہ ملازموں کو ازالے کے لیے لیبر عدالتوں سے رجوع کرنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے جس کے باعث اُن پر استحصال کا شکار ہونے کے شدید خطرات منڈلاتے رہے۔ صنعتوں پر مرکوز متعدد قوانین کی غیر فعالیت اور حکومت کی جانب سے نفاذ میں کوتاہی نے بہت سے شعبوں میں آجروں کو کام کے ماحول، ملازمین سے برتاؤ، کام کے اوقات اور تنخواہ کے معاملات میں جوابدہی سے نسبتاً بریت دے رکھی تھی۔

محنت کشوں سے متعلق قومی قوانین کو نافذ کرنا صوبائی حکومتوں کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ محدود وسائل، بدعنوانی اور ناکافی انتظامی ڈھانچے کی عدم موجودگی کے باعث نفاذ غیر موثر تھا۔ صوبائی حکومت کی جانب سے بھرتی کردہ معائنہ کاروں کی تعداد لگ بھگ چھ کروڑ چالیس لاکھ محنت کش افرادی قوت کے امور کی دیکھ بھال کے لیے بالکل ناکافی ہے۔ متعدد کارکن، خاص طور پر غیر رسمی شعبہ میں کام کرنے والے، اپنے حقوق سے بے خبر تھے۔ لیبر معائنہ کے لیے محدود وسائل اور بدعنوانی کے باعث لیبر انسپیکشن اور سزائیں لیبر قوانین کی خلاف ورزی کی روک تھام کے حساب سے ناکافی تھیں۔ کم از کم تنخواہ اور لیبر حقوق کے تنازعات کو قومی عدالتوں کے بجائے اندرونی تصفیہ انتظامات کے ذریعہ حل کیا گیا، جس کی وجہ سے بدعنوانی میں اضافہ ہوا جبکہ اس ضمن میں دی جانے والی سزائیں دھوکہ دہی جیسے متعلقہ جرائم کی نسبت بہت کم تھیں۔

سنہ ۲۰۱۹ء میں منظور ہونے والا سندھ ویمن ایگریکلچر ورکرز بل جو زراعت، مویشی اور ماہی گیری شعبوں میں عورتوں کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ قانون کم از کم اجرت، بیماری اور زچگی کی چھٹی، کام کے اوقات کا تعین، ملازمت کے تحریری معاہدہ، انجمن سازی اور فلاحی تحفظ اور قرضہ تک رسائی سمیت مختلف حقوق و مراعات کی ضمانت دیتا ہے۔

سندھ کی صوبائی حکومت نے ۲۰۱۷ء میں پیشہ ورانہ صحت اور تحفظ کا قانون پاس کیا تھا لیکن حالیہ سال کے اختتام تک اُس کا نفاذ عمل میں نہیں آسکا تھا۔ اس نوعیت کا قانون دیگر صوبوں میں موجود نہیں ہے۔ ستمبر میں پنجاب حکومت نے طبّی تدریسی اداروں میں اصلاحات کا آرڈیننس جاری کیا، جس میں حفظان صحت کے شعبہ سے متعلق کئی موجودہ قوانین میں ترمیم کی گئی اور نجی شعبہ کے پانچ پیشہ ور افراد پر مشتمل انتظامی بورڈ سرکاری ٹیچنگ اسپتالوں کو چلانے کے لیے تشکیل دیا گیا۔

چھ جولائی کو سندھ حکومت نے ۲۰۱۲ء بلدیہ فیکٹری جلاؤ گھیراؤ کی چھبیس صفحات پر مشتمل جوائنٹ انویسٹیگیشن رپورٹ جاری کی، جس میں ۲۶۰ مزدور جاں بحق ہوئے تھے۔ ٹیم کے مطابق فیکٹری کو لگائی گئی آگ حادثہ نہیں بلکہ دہشت گردی کی کارروائی تھی۔ فیکٹری کو بھتہ نہ دینے پر جلایا گیا۔ ستمبر میں دو ملزمان کو سزا دی گئی۔

قومی سطح پر مختلف شعبوں میں صحت اور حفاظت کے انتظامات غیر معیاری تھے۔ صحت وصفائی کے بین الاقوامی معیار پر پورا اترنے میں ناکامی نے ملک کی بیرون ملک درآمد کے لیے قابل بھروسہ ملک ہونے کے حوالے سے شکوک و شبہات کو جنم دیا۔ کان کنی کی صنعت میں حفاظت اور صحت کے اصولوں کی پاسداری میں سخت کوتاہی تھی۔ بہت ساری کانوں میں داخلہ، اخراج اور ہوا خوری کا ایک ہی

سوراخ تھا۔کام کرنے کے خطرناک ماحول سے جان چھڑانے کے لیے مزدوروں کے پاس روزگار گنوانے کا خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ غیر روایتی شعبہ کے کارکنوں، خاص طور پر پوشیدہ جگہوں جیسے گھریلو ملازمت میں، صحت اور حفاظت کے حوالہ سے نازک صورتحال کا سامنا تھا۔ مذکورہ سال کے دوران مقام ملازمت پر اموات اور حادثات کے حوالہ سے سرکاری طور پر جمع کردہ اعداد و شمار موجود نہیں تھے۔ مل منتظمین اکثر آتشزدگی یا دیگر حادثہ کے متاثرہ فرد کی شناخت کی تصدیق سے قاصر تھے کیوں کہ ان افراد کا کنٹریکٹ ملازمین ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا۔

سات ستمبر کے دن خیبر پختونخوا کے علاقہ مہمند میں سنگ مرمر کی کان بیٹھنے کے نتیجہ میں ۲۴ مزدور جاں بحق ہو گئے۔ لیبر کارکنوں کی رائے کے مطابق مزدوروں کو اکثر خطرناک حالات میں کام کرنا پڑتا ہے اور نجی مائننگ کمپنیاں مزدوروں کو صحت اور حفاظت کی سہولیات مہیا کرنے میں ناکام رہتی ہیں۔ پاکستان مائین ورکرز فیڈریشن کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۰۱۹ء میں ملک میں ۱۸۶ کان کن جاں بحق ہوئے۔ اپریل ۱۴ کو ہرنائی بلوچستان میں ٹرالی کے ٹکر میں دو مزدور فوت ہو گئے۔ بروز ۲۰ مارچ بلوچستان کے علاقہ ڈیرہ بگٹی میں گیس کے دھماکہ میں سات کان کن ہلاک اور تین زخمی ہوئے۔ حکومت نے پیشہ ورانہ حفاظت اور صحت کے قوانین کا موثر اطلاق نہیں کیا اور اِس نوعیت کے جرائم کی سزا غفلت و لاپرواہی جیسے جرائم کی طرح زیادہ نہیں تھی کہ اُن کی روک تھام کی جا سکے۔

ختم شد